اردو رسائل و جرائد میں فن ترجمہ سے متعلق شائع شدہ مضامین کا توضیحی اشاریہ

تحقیقی مقالہ

برائے ڈاکٹر آف فلاسفی

مطالعات ترجمہ۔سال 2016-2021

مقالہ نگار

محمد نعمان علی

En.No.A161121

زیر نگرانی

ڈاکٹر محمد جنید ذاکر

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ ترجمہ، مانو

شعبۂ ترجمہ

اسکول برائے السنہ، لسانیات و ہندوستانیات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

گچی باؤلی، حیدر آباد۔تلنگانہ۔500032

D E C L A R A T I O N

I do hereby declare that this thesis entitled "**URDU RASAIL O JARAID ME FAN –E- TARJUMA SE MUTALIK SHAYA SHUDA MAZAMIN KA TAWZIHI ISHARIYA**" (Descriptive Index of Translation Studies articles published in Urdu Magazines and Journals) is original research carried out by me. No part of this thesis was published, or submitted to any other University / Institution for the award of any Degree / Diploma.

Mohammed Noman Ali

Place: Hyderabad

Date:

C E R T I F I C A T E

This is to certify that the dissertation entitled "**URDU RASAIL O JARAID ME FAN –E- TARJUMA SE MUTALIK SHAYA SHUDA MAZAMIN KA TAWZIHI ISHARIYA**" (Descriptive Index of Translation Studies articles published in Urdu Magazines and Journals), submitted for the award of the Degree of Doctor of Philosophy in Translation School of Languages, Linguistics and Indology, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad, is the result of the original research work carried out by **Mr. Mohammed Noman Ali** under my supervision and to the best of my knowledge and belief, the work embodied in this thesis does not form part of any thesis /dissertation already submitted to any University/Institution for the award of any Degree/Diploma.

Head

(Department of Translation)

Signature of Research Supervisor

Dr. Mohd Junaid Zakir

Place: Hyderabad

Date:

Dean

(School of Languages, Linguistics and Indology)

URDU RASAIL O JARAID ME FAN –E- TARJUMA SE MUTALIK SHAYA SHUDA MAZAMIN KA TAWZIHI ISHARIYA

Thesis submitted for the award of the Degree of

Doctor of Philosophy in Translation Studies

Year-2016-2021

Submitted By

MOHAMMED NOMAN ALI

En.No.A161121

Under the Supervision of

Dr.Mohd Junaid Zakir

Assistant Professor

Department of Translation Studies

Submitted to

Department of Translation Studies

School of Languages, Linguistics and Indology

MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

Hyderabad–500 032–INDIA

تلخیص (Abstract)

اردو رسائل و جرائد میں فن ترجمہ سے متعلق شائع شدہ مضامین کا توضیحی اشاریہ

تحقیقی مقالہ برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی

مطالعات ترجمہ۔سال 2016 -2021

مقالہ نگار

محمد نعمان علی

En.No.A161121

زیر نگرانی

ڈاکٹر محمد جنید ذاکر

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ ترجمہ، مانو

شعبۂ ترجمہ

اسکول برائے السنہ، لسانیات وہندوستانیات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

گچی باؤلی، حیدرآباد۔تلنگانہ۔500032

فہرست ابواب

ابتدائیہ

باب اوّل　　فنِ ترجمہ نگاری

باب دوّم　　ترجمہ بحیثیت شعبۂ علم

باب سوّم　　اشاریہ سازی کی اہمیت

باب چہارم　　فن ترجمہ سے متعلق مضامین کا توضیحی اشاریہ

باب پنجم　　حاصل مطالعہ

کتابیات

اردو رسائل و جرائد میں فن ترجمہ سے متعلق شائع شدہ مضامین کا توضیحی اشاریہ

ابتدائیہ:

میری تحقیق کا عنوان "اردو رسائل و جرائد میں ترجمہ سے متعلق شائع شدہ مضامین کا توضیحی اشاریہ " ہے۔ ویسے اردو زبان میں رسائل و جرائد کی اشاعت کا سلسلہ ڈیڑھ سو سال قبل شروع ہوا لیکن میری تحقیق کے مطابق ترجمہ سے متعلق شائع شدہ مضامین کا ایک بھی موضوعاتی توضیحی اشاریہ اب تک مرتب نہیں ہوا۔ چنانچہ میں نے اپنے گائیڈ محترم کے مشورے سے اس کام کو انجام دینے کا فیصلہ کیا۔تاہم جب میں نے یہ کام ہاتھ میں لیا تو مجھے پتہ چلا کہ یہ ایک انتہائی مشکل کام ہے جیسا کہ میں نے بتایا کہ پچھلے ڈیڑھ سو سالوں میں اردو زبان کے سینکڑوں رسائل و جرائد شائع ہوئے جن میں کچھ ماہانہ، کچھ سہ ماہی اور کچھ ششماہی و سالنامے تھے۔ان تمام کی تلاش،اور ان تک رسائی بے حد دشوار کن ثابت ہوئی جیسا کہ یہ برصغیر کے مختلف لائبریریوں اور تحقیقی اداروں میں موجود تھے۔تاہم گائیڈ کی رہنمائی اور دیگر اساتذہ کے تعاؤن و مشورے سے میں تقریباً5000 میگزین و جرائد کو کھنگالنے کے قابل ہو ہی گیا اور میں نے نہ صرف ایک محقق کو اس رسالے سے متعلق معلومات دینے کی کوشش کی بلکہ ساتھ ہی اس مضمون کا ایک مختصر خلاصہ بھی دے دیا جس سے کسی قاری یا محقق کو مضمون کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

باب اول۔ فنِ ترجمہ نگاری

نظریہ عربی لفظ ہے۔ جس کے لفظی معنی دیکھنا ہیں۔ نظریہ سے مراد یہ ہے کہ کسی بھی درپیش معاملہ میں کیا رائے ہے یا اُسے فرد کس نظر سے دیکھتا ہے۔ دراصل نظریہ کا تصور یونانی فلسفہ سے آیا ہے جہاں اسے تھیوری کہا جاتا تھا اور اس کا اصل مطلب کسی شئے کو ناظر اپنی مخصوص نظر سے دیکھتا ہے مگر فلسفہ میں اسے غور و فکر یا قیاس گردانا جاتا ہے۔انگریزی میں نقطۂ نظر کو Point of view کہا جاتا ہے۔اور اردو میں نظریہ کے مترادف الفاظ دھیان، سوچ، تفکر، نظر و فکر وغیرہ ہوتے ہیں۔ نظریہ بنیادی طور پر ایک تصور ہوتا ہے یا وہ ایک فرض قسم کی دلیل ہے یا ایک عمومی فکر ہے یا اس خیال کا نتیجہ ہوتا ہے جو سیاق و سباق پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ نتیجہ مثال کے لئے بھی ہو سکتا ہے جو اصل فعل یا کام کی وضاحت کے لئے ہو۔ یا نظریہ خیالات یا تصورات یا فکر کے آغاز و ابتداء کا نام ہے۔

عام طور پر نظریہ لفظ کی نسبت کسی ملک، شخصیت، علم اور ادارہ وغیرہ کی طرف کی جاتی ہے۔ جیسے ہندوستانی نظریہ یا ہندوستانی نظریات، نظریہ پاکستان، کارل مارکس کا نظریہ، مولانا آزاد کا نظریہ تعلیم، علامہ اقبال کا نظریہ، فلسفیانہ نظریات اور دو قومی نظریات وغیرہ۔ اور اسی اعتبار سے اس ملک، شخصیت، علم، موضوع، مواد وغیرہ کے بنیادی تصورات سے بحث کی جاتی ہے۔

نظریہ کے دیگر مفاہیم بھی ہو سکتے ہیں جیسے:

☆ وہ اصول جنھیں حقائق کی تشریح کے لئے وضع کیا گیا ہو۔

☆ وہ بیان جو وسیع پیمانے پر ماحول کی پیش قیاسی کے لئے استعمال کیا جائے۔

☆ آرٹ یا سائنس کی وہ قسم ہے جس کے بیانات مسلمہ اصول پر مبنی ہوں۔

☆ وہ ضابطے جو باضابطہ نقطۂ نظر کی تشکیل انجام دیتے ہوں۔

☆ وہ تصور جس کے واسطے سے پیچیدہ نظام کو سمجھنا آسان ہو۔

☆ فطرت کا قانون۔

☆ عمومی نظریہ جو فطرت کے حقائق کو بیان کرے۔

ترجمہ کے نظریات کے ذیل میں دو باتیں نہایت اہمیت کی حامل ہوا کرتی ہیں۔ ایک یہ کہ اصل زبان کے متن (لفظ، فقرے، جملے) کا معنی و مفہوم اور اس کی منتقلی کا مقصد ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ترجمہ ہونے کے باوجود بھی اس میں ترجمہ پن نہ جھلک پائے۔ یعنی اس قدر ترجمہ سلیس اور رواں ہو کہ اس میں اصل کی سی کیفیت محسوس ہونے لگے اور کسی بھی طرح الگ سے ترجمہ کا احساس نہ ہو۔ اس بات میں جابجا تکلف محسوس نہ ہوتا ہو اور دشواریاں نہ ہوں اور ترجمہ پڑھنے سے ایک طرح کا لطف ملتا رہے۔ اور یہ بھی خیال ہے کہ پڑھنے سے ترجمہ، ترجمہ معلوم ہو۔

بعض علمائے ادب کے مطابق ترجمہ کا نظریہ مختلف زبانوں کے درمیان ایک طرح کا تعلق ہوتا ہے اور یہ تقابلی لسانیات کی ایک شاخ ہے اور بھی اس طرح کے دیگر خیالات پائے جاتے ہیں لیکن ان سب میں اہم بات یہ ہے کہ ترجمہ کے نظریہ کو ترجمہ کے عمل اور ماحصل کی وضاحت ضرور کرنی چاہئے اور اس کو توضیحی بنانا چاہئے۔ ترجمہ ہر زبان کا ایک جزو لاینفک ہے جس کو کسی بھی دور میں الگ نہیں کیا جاسکا۔ ایک رومی نژاد فردایرک جیکب سن نے ترجمہ کے نظریات سے متعلق تین اہم باتیں ذکر کی ہیں۔

(1) یک لسانی ترجمہ '' Intralingual Translation''کسی زبان کی علامتوں کی اس زبان میں بازلفظی۔

(2) بین لسانی ترجمہ: کسی زبان کی علامتوں کی دوسری زبان کی علامتوں میں بازلفظی۔

(3) کسی زبان میں علامتوں کی غیر حرفی علامتی نظاموں میں تبدیلی یا منتقلی۔ اس ماہیتِ قلب کو تبدیلی یا ہیئت سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ اس باب میں میں نے درج ذیل عناوین پر بھی سیر حاصل گفتگو کی۔

ترجمہ کے نظریات کا تاریخی پس منظر، فن ترجمہ نگاری، تقسیمِ ترجمہ بہ لحاظِ طریقہ کار، تقسیمِ ترجمہ بہ لحاظِ موضوع، ترجمہ نگاری کے اغراض و مقاصد، ترجمہ میں تہذیبی و لسانی مسائل، زبان پر مہارت، قواعد سے واقفیت، محاورات اور ضرب الامثال کے تراجم کی نزاکتیں، اسم سے واقفیت، اصطلاح سازی کے مسائل سے واقفیت، اصل یا متن کی زبان، مترجم کی زبان، مترجم کی ذات، ترجمہ کی نوع، مترجم کی خصوصیات وغیرہ

باب دوم۔ ترجمہ بحیثیت شعبۂ علم

اس میں شک نہیں کہ ترجمہ اب ایک باضابطہ علم کا شعبہ بن چکا ہے۔ چوں کہ یہ ایک بین شعبہ جاتی علم کا میدان ہے اس لئے اس کی عمومیت کا اعتبار کرتے ہوئے اس کو مطالعاتِ ترجمہ کہا جارہا ہے۔ اس میں ترجمہ، ترجمہ کے نظریات، توضیحات، اصول و قواعد اور اطلاقات کا خصوصی طور پر مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہ بات یقیناً درست ہے کہ خصوصی طور پر اردو میں ترجمہ کے سلسلہ میں زیادہ ٹھوس کام انجام نہیں دئے گئے اور ابھی ترجمہ کے سارے نظریات اور اصول و قواعد کے سلسلہ میں مباحث کی کافی گنجائش موجود ہے اور اس علم ترجمہ کے متعلق توضیحات کے دروازے کھلے ہوئے ہیں جن پر تحقیق کی جاسکتی ہے تاہم یہ شعبہ ابھی ابھر رہا ہے۔ جامعات میں بھی اس طرف پوری توجہ نہیں دی گئی اور چند ہی جامعات میں یہ شعبہ ملتا ہے۔ ترجمہ سے متعلق ساری بحثیں مطالعاتِ ترجمہ کے جامع لفظ میں آجاتی ہیں جس کو علم ترجمہ کہا گیا ہے۔

بنیادی طور پر اس علم کے دو پہلو نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک پہلو وہ ہے جو ترجمہ کے نظریات و افکار سے متعلق ہے اور دوسرا اطلاقی پہلو ہے۔ اس تقسیم کو تجریدی اور اطلاقی بھی کہا جاتا ہے۔ تجریدی پہلو میں ترجمہ کے افکار و نظریات اور اصول و ضوابط شامل ہیں۔ جب کہ دوسرے پہلو میں ترجمہ کے انھیں نظریات کے اطلاقات سے بحث ہوتی ہے۔ نظریہ دراصل کسی موضوع سے متعلق کافی غور و فکر کرنے کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ عمومی طور پر نظریہ میں آفاقی حقائق ہوتے ہیں اور اصول و ضوابط ہوتے ہیں۔ Holmes نے نظریہ کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا ہے یعنی عمومی اور جزوی۔

مطالعاتِ ترجمہ کے عمومی نظریات:

مطالعاتِ ترجمہ کی یہ وہ شاخ ہے جس میں ترجمہ کے عمومی اصول اور آفاقی نظریات سے بحث ہوتی ہے اور ترجمہ کے نظریات کا اطلاق ہوتا ہے چاہے کسی بھی موضوع سے متعلق ہو۔ جیسے یہ نظریہ و اصول کہ ترجمہ میں دیانت داری اور غیر جانب

داری چاہئے یا یہ کہ مترجم کے لئے اصل اور ہدفی دونوں زبانوں پر دسترس ہونی چاہئے یہ سب بنیادی اصول ہیں جن کا اطلاق ہر جگہ ہوتا ہے۔ یہ ترجمہ کے عمومی نظریات کی بات ہے۔

ترجمہ کے جزوی نظریات بھی ہوتے ہیں جن کا اطلاق عمومی نہیں ہوتا ہے بلکہ خصوصی ہوتا ہے۔ اس جزوی قسم کی دیگر شاخیں بھی ہو سکتی ہیں۔ جیسے :

۱) انسانی تراجم، ۲) مشینی تراجم، ۳) مشین اعانتی انسانی تراجم، ۴) انسانی اعانتی مشینی تراجم

علاوہ ازیں ترجمہ کے نظریات، علاقہ، معیار، متن، زمانہ اور مخصوص مسائل کی بنیاد پر بھی متعین ہوتے ہیں ان کے علاوہ کے بھی امکانات ہو سکتے ہیں ویسے نظریہ سازی کے معاملہ میں ابھی کافی گنجائش موجود ہے۔

مطالعات ترجمہ کا دوسرا پہلو اطلاقی پہلو ہوتا ہے جس میں مترجم کی تربیت اور ترجمہ کے دیگر اسباب و عوامل شامل ہیں۔ یہ پہلو بنیادی طور پر عملی ہوتا ہے اس میں ترجمہ کی تنقید بھی شامل ہے۔ اس طرح ترجمہ بہ حیثیت شعبہ علم نہایت کار گر اور ممد و معاون ثابت ہو رہا ہے۔

ترجمہ کی نوعیت: ترجمہ میں یہ بات نہایت اہمیت کی حامل ہوتی ہے کہ مترجم اس بات پر نظر رکھے کہ وہ کس کے لئے ترجمہ کر رہا ہے یعنی اس کا قاری کون ہے اور اس کی زبان، تہذیب اور تاریخ و تمدن کی کیا حالت ہے ؟ اس لئے کہ دونوں زبانوں کی تہذیب الگ ہوتی ہے اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لفظ تو ایک ہی ہوتا ہے مگر سیاق و سباق کے اعتبار سے اس کا مفہوم بدل جاتا ہے یا اسی طرح لفظ تو ایک ہوتا ہے مگر مختلف علوم کی اصطلاحات کے اعتبار سے اس کے معنی و مفہوم میں فرق ہوتا ہے جیسے مثال کے طور پر لفظ موضوع ہے۔ علم لغت کے اعتبار سے اس کے معنی الگ ہوتے ہیں ایسے مواقع پر مترجم کو ان سارے امور سے واقفیت ناگزیر ہو جاتی ہے تبھی وہ ترجمہ سے انصاف کر سکتا ہے۔ اسی طرح بہت سے محاورات بھی ہوتے ہیں جن کے مفہوم میں فرق کرنا ضروری ہوتا ہے اور ترجمہ کرتے وقت اس آزمائش سے مترجم کو گزرنا پڑتا ہے۔

انتقالِ فکر کے مختلف پہلو: ایک زبان کے مواد کو دوسری زبان میں منتقل کرنا ہی ترجمہ کا عمل کہلاتا ہے اس منتقلی کے عمل میں کئی پہلو قابلِ توجہ ہوتے ہیں جیسے مترجم کی ذات، قابلیت، دونوں زبانوں پر دسترس، ترجمہ کی نوعیت، کیفیت ،اصل زبان اور ہدفی زبان کی خصوصیات، زبانوں کا پسِ منظر، منتقل کئے جانے والے مواد کا پس منظر، قاری کی ذہنی اور علمی سطح ،اصل اور ہدفی زبان کا اسلوب، مترجم اور قاری کا مذہب و مسلک یا عقائد و مذہبی جذبات، زمانہ، مقام، سوسائٹی اور تہذیب کا منظر نامہ جو قاری اور مترجم سے متعلق ہوتا ہے۔ اس میں وہ محرکات بھی اہم ہوتے ہیں جو ایک مترجم کو ترجمہ یا مواد کی منتقلی کے لئے مہمیز کرتے ہیں اور اس کا مقصد بھی نہایت اہم ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ قابلِ قدر مواد کی اہمیت ہدفی زبان میں زیادہ ہوتی ہے جب کہ یہ ممکن ہے کہ اصل زبان میں اس کی اس قدر اہمیت نہ ہو۔

ترجمہ اور زبان کا پہلو: عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جو بڑی زبانیں ہیں پہلے ان میں تراجم ہوتے ہیں پھر ان کی اہمیت کے پیش نظر دیگر زبانوں میں تراجم ہوتے ہیں جو علاقائی زبانیں ہوتی ہیں جیسے ہندوستان میں بڑی زبانیں سمجھی جانے والی صرف دو ہی زبانیں نظر آتی ہیں۔ ۱) انگریزی ۲)ہندی۔اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی زبان سے پہلے ترجمہ انگریزی یا ہندی میں زیادہ ہوگا پھر اس کے مختلف علاقائی زبانوں میں یہ تراجم الگ الگ طور پر ہوتے ہیں۔ لہٰذا انگریزی اور ہندی سے اردو، تلگو، کنڑ اور دیگر زبانوں میں یہ تراجم کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ یہ سب تفریق دراصل انسانوں ہی نے کی ہے۔ یہ دراصل زبانوں کے مانوس یا غیر مانوس ہونے کا ہی مسئلہ ہے ورنہ زبان کوئی چھوٹی بڑی نہیں ہوتی ہے۔مانوس یا غیر مانوس ہونے کے نتیجہ میں کسی کا دامن بھرا ہوتا ہے اور کسی کا خالی خالی ہوتا ہے۔

ترجمہ میں اسلوب کی منتقلی کے مسائل: یقیناً یہ بات درست بلکہ واضح ہے کہ قلم کار یا مصنف وادیب اور شاعر کی پہچان اس کے اپنے اسلوب سے ہوتی ہے جس میں انفرادیت وندرت ہوتی ہے جیسے محمد حسین آزاد کا اسلوب، رشید احمد صدیقی کا اسلوب، مولانا آزاد کا اسلوب، مولانا عبدالماجد دریابادی کا اسلوب اور شعراء میں میر، غالب، اور اقبال ہر ایک کا اسلوب منفرد ہے ،جداگانہ ہے۔ غرض مترجم کو اصل زبان کے اسلوب کی منتقلی کے مسائل سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے ورنہ اگر مترجم اسے نظر انداز کردے اور اس کی انفرادیت اور اس کی فضاء کو چھوڑ بیٹھے تو وہ اس سے انصاف نہیں کر سکتا ہے۔اصل کے اسلوب میں جو لطف اور جمالیاتی انداز ہوتا ہے وہ ترجمہ میں بھی جھلکنا چاہئے تاکہ قاری کو اصل زبان کے ادیب یا شاعر و قلم کار کا مزاج ومنہاج اور اسلوب سمجھ میں آجائے اسی لئے مترجم کو دونوں زبانوں پر دسترس ہونے کا نظریہ نہایت اہمیت کا حامل ہے بلکہ یہ ترجمہ کے باب میں پہلی شرط کے مترادف ہے تاکہ ترجمہ میں لطف آفرینی کے عناصر بڑھیں یہ اور بات کہ کبھی مترجم کو ترجمہ میں مداخلت کے عمل سے بھی گزرنا پڑتا ہے جہاں جہاں ضرورت محسوس ہو اور یہ مداخلت مختلف لحاظ سے ہوتی ہے مگر اس میں بھی بنیادی طور پر مترجم اسلوب کی انفرادیت کو برقرار رکھنے کوشش کرے۔

باب سوم۔اشاریہ سازی کی اہمیت

اشاریہ: یہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لفظی معنی اشارہ کرنا ہے اور اصطلاحی معنی میں حروف تہجی کی ترتیب کے اعتبار سے مضامین کی تفصیلی فہرست تیار کرنا اشاریہ سازی کہلاتا ہے۔ واضح رہے کہ لفظ اشاریہ عربی ہے اور "سازی" لفظ فارسی ہے۔ اس طرح یہ عربی اور فارسی کے دو لفظوں سے وضع شدہ ایک مرکب اصطلاح ہے۔اشاریہ کو انگریزی زبان میں INDEX کہا جاتا ہے۔ اشاریہ سازی میں مصنفین کے ناموں اور مضامین کی فہرست کو خصوصیت کے ساتھ حروفِ تہجی کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے جس میں نظم ونثر پر مشتمل مختلف تخلیقات کا حوالہ دیا جاتا ہے اور اس میں کتاب، رسالہ، ماہنامہ، جریدہ اور ماہ وسال کا اندراج

ضروری ہوتا ہے تاکہ ایک موضوع یا فن سے متعلق مختلف تحقیقی، تنقیدی اور تعارفی مضامین محققین کو یکجا فراہم ہو جائیں۔ چوں کہ تحقیق میں کتابیات کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور اشاریہ سازی بھی کتابیات ہی کے زمرہ کے تحت آتی ہے اس لئے اس کی بھی اہمیت وافادیت مسلمہ ہو چکی ہے۔ اشاریہ سازی کے ذریعہ مختلف علمی وادبی شخصیات کے نام، مقامات، کتب اور مضامین ہی سامنے نہیں آتے بلکہ اس کے ذریعہ مختلف مفید معلومات بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔

سطور بالا میں اشاریہ کی تعریف سے دو باتیں خاص طور پر واضح ہوتی ہیں۔ (۱) مضامین کی تفصیلی فہرست (۲) حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب۔ یہ دونوں چیزیں اشاریہ سازی میں ملحوظ رکھی جاتی ہیں۔ مضامین کی تفصیلی فہرست میں دیگر جزئیات بھی شامل ہو جاتی ہیں جیسے صفحات کا نمبر، ماہ وسال اور مطبع وغیرہ جن سے قاری یا تحقیق کار کو باسانی مختلف مضامین اور تخلیقات و شذرات اور تحقیقات و تنقیدات کا پتہ چل جاتا ہے۔ اور اس میں خاص بات یہ ہوتی ہے کہ اشاریہ سازی کے عمل میں محقق کو مختلف پہلوئوں پر نظر رکھنی پڑتی ہے اور کثرتِ مطالعہ و وسعتِ مطالعہ کا ثبوت دینا ہوتا ہے مگر جب یہ سخت مرحلہ گزر جاتا ہے اور اشاریہ سازی ہو جاتی ہے تو اس سے دوسرے محققین کو بیک وقت یکجا مواد بآسانی فراہم ہو جاتا ہے اور اشاریہ سازی کا عمل دوسرے محققین کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوتا ہے اور وہ گویا صدہا معلومات کا نچوڑ ہوتا ہے۔

سطورِ بالا میں ذکر کردہ دو باتیں جو اشاریہ سے متعلق ہیں نہایت اہم ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے دیگر محققین کی پیش کردہ تعریفات بھی ملاحظہ کیں تاکہ اشاریہ سازی کی تعریف اور واضح ہو جائے۔ چنانچہ جارج ایس بون نے اشاریہ کی جو تعریف کی ہے اس کے مطابق ایک اشاریہ ایک مکمل علمی اکائی ہے (مثلاً کتاب، سلسلہ، مطبوعات یا جلد نمبر رسالہ) نام، فنی اصطلاح، موضوع، مقام، فارمولہ، ہندسہ یا اسی طرح کے دوسرے اہم عنصر کی ایک مفصل الف بائی فہرست ہے جو ان صفحات کی نشاندہی کرتی ہے جن میں ان پر بحث کی گئی ہے۔ اشاریہ سازی کا عمل دوسرے فنون کی طرح ارتقائی مراحل طئے کرتے ہوئے اب ایک مکمل فن کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اسی لئے اردو زبان میں اس کی شروعات تاخیر سے ہوئی اور یہ بات مبنی بر حقیقت ہے کہ اس فن کی طرف اردو میں کم ہی توجہ دی گئی ہے البتہ زیادہ تر رسالوں اور ماہناموں کی اشاریہ سازی پر توجہ مبذول کی گئی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں اردو میں اشاریہ سازی کی روایت مستحکم ہو چکی ہے اور اس میں بھی خصوصاً گذشتہ چند برسوں سے تیزی آئی ہے اور اس روایت کو استحکام نصیب ہوا ہے۔

اردو میں اشاریہ سازی بہت بعد میں در آئی۔ اس سے پہلے انگریزی و دیگر زبانوں میں اس کا آغاز ہو چکا تھا۔ البتہ یہ بھی حیرت انگیز بات ہے کہ اردو کی ابتدائی کتابوں میں اشاریہ کا التزام ملتا ہے جب کہ بعد کے ادوار میں یہ روایت مفقود ملتی ہے چنانچہ دہلی کالج سے شائع شدہ 1847ء کی کتابوں میں اشاریے ملتے ہیں۔ علاوہ ازیں حیاتِ جاوید نامی پریس 1901ء میں بھی اشاریہ ملتا ہے۔ اسی طرح خود حیدر آباد دکن میں دارالترجمہ کی کتابوں میں بھی اشاریہ کا اہتمام ملتا ہے۔ البتہ یہ قابل ذکر بات ہے کہ اردو میں

اشاریہ سازی پر کام دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلہ دیر سے شروع ہوا تاہم اس میں قابل لحاظ کام دستیاب ہے۔اس سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ اٹھارویں صدی میں رسائل کی اشاعت کی تعداد زیادہ بڑھنے لگی اور مضامین کی تعداد جب روز افزوں ہونے لگی تو اشاریہ ہی اس کی شاہ کلید تھا اور سائنسدانوں نے اس کی ضرورت کو محسوس کیا جس کی وجہ سے رسائل کی نہ صرف داغ بیل پڑی بلکہ اشاریہ سازی کے عمل کی شروعات ہوئی۔چوں کہ کسی بھی موضوع پر کیا کام ہوا ہے اس کا جاننا از حد ضروری ہوتا ہے تاکہ سابقہ تحقیق اگر اطمینان بخش نہ ہو تو اشاریہ سازی کے ذریعہ اس کے تشنہ پہلوئوں پر نظر رکھی جاسکتی ہے یا تحقیق کے معیار کو بڑھا یا جاسکتا ہے اور اس طرح اچھے سے اچھا کام کیا جاسکتا ہے۔اس اہمیت کے پیش نظر اشاریہ سازی کی شروعات ہوئی۔

اشاریہ سازی کے چند اہم نکات:

۱) اشاریہ سازی شخصیات، مقامات، کتابوں اور مصنفوں کے لحاظ سے کرنی پڑتی ہے۔

۲) اشاریہ سازی کے لئے کتاب، رسالے اور اخبارات کے مندرجات کو ملاحظہ کرنا ہوتا ہے۔

۳) اشاریہ سازی کی وسعت پر نظر رکھنی ضروری ہوگی۔

۴) اشاریہ کے لئے مختص چیزوں وعدم مختص چیزوں پر نظر رکھنی ہوتی ہے۔

۵)اشاریہ سازی کے لئے ابواب بندی کرنی ضروری ہوتی ہے۔

۶)متعلقہ مواد کو مختلف زبانوں کے اعتبار سے بھی تلاش کرنے اور شامل کرنے پر نظر رکھنی ہوگی۔

باب چہارم۔ فن ترجمہ سے متعلق مضامین کا توضیحی اشاریہ

علم ترجمہ پر مضامین کی تلاش کے دوران میں نے پانچ ہزار سے زائد رسالوں کا جائزہ لیا اور ان میں سے سو مضامین کا تفصیلی اشاریہ تیار کیا۔دوران تحقیق مجھے محسوس ہوا کہ ،اردو میں پچھلے ڈیڑھ سو سال سے تقریباً برصغیر کے ہر ضلع سے مختلف رسالے و جرائد شائع ہو رہے ہیں جن کی موجودہ تعداد لاکھوں میں پہنچتی ہے ایسے میں کسی محقق کے لیے ان سے استفادہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ان رسائل و جرائد کا اشاریہ نہ ترتیب دیا جائے۔ گو کہ فی زمانہ بہت سے رسائل و جرائد کی کاپیاں آن لائن دستیاب ہیں لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ ہونے سے ان سے استفادہ بہت مشکل ہے۔ پھر اشاریہ سازی کی بھی اپنی مشکلات ہیں۔اشاریہ مرتب کرنے والوں کے سامنے ہمیشہ یہ سوال رہتا ہے کہ کن معلومات کو لیا جائے اور کن معلومات کو چھوڑ دیا جائے، پھر یہ کس محقق کے لیے کون سی معلومات کارآمد ہوں گی وغیرہ۔ابھی تک چونکہ اردو زبان میں اشاریے کا بہت کم کام ہوا چنانچہ اس میں نقوشِ راہ بھی کم ملتے ہیں اور اشاریہ سازی ایک انتہائی بوجھل کام بن جاتی ہے۔ زیر نظر تحقیق میں، میں نے درج ذیل معلومات ایک جدول کی شکل میں فراہم کیں تاکہ قاری یا محقق کو فوری طور پر کسی رسالے، جریدے میں شائع شدہ مضمون سے متعلق معلومات دستیاب ہو جائیں۔

مضمون کا عنوان:	
مضمون نگار:	رسالہ کا نام:
صفحہ نمبر:	جلد نمبر: شمارہ نمبر:
دورانیہ:	سن اشاعت:
مقام اشاعت:	مطبع:
ناشر:	ایڈیٹر:

اس کے علاوہ پھر میں نے اس شائع شدہ مضمون کا خلاصہ بھی پیش کیا ہے تاکہ اس مضمون میں شامل مواد کی بھی معلومات مل جائیں۔ ان تمام معلومات کو اکٹھا کرنا ایک دقت طلب کام تھا تاہم اپنے گائیڈ کی زیر نگرانی میں اس سے عہدہ برآ ہونے میں الحمدللہ کامیاب ہو گیا۔

باب پنجم۔ حاصل مطالعہ

دوران تحقیق مجھے پتہ چلا کہ اردو میں شخصیات اور رسائل و جرائد کے تو اشاریے موجود ہیں لیکن کسی شعبہ علم کے مضامین کا اشاریہ مجھے نہیں ملا۔ ابتدا میں میرا منصوبہ تھا کہ ہندوستان کی مشہور لائبریریوں کا دورہ کر کے وہاں موجود تمام اہم اردو رسائل و جرائد میں علم ترجمہ کے موضوع پر رقم شدہ مضامین کو فہرست کو جمع کر دوں تاہم جب میں نے اس کام کو شروع کیا تو پتہ چلا کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ اس لیے کہ کئی لائبریریوں میں جہاں کیٹلاگ میں کتابوں کے نام موجود ہیں وہاں وہ کتابیں لائبریری سے غائب ہیں اور اس کے علاوہ اردو کے تمام موقر رسائل و جرائد ضروری نہیں تھا کہ چند لائبریریوں میں دستیاب ہو جائیں۔ اس لیے کہ ان رسائل و جرائد کی تعداد ان گنت ہے اور ساتھ ہی ان میں سے کئی اب بند بھی ہو چکے ہیں اور ان کی پرانی متعلقہ فائلیں ٹھیک ٹھاک حالت میں دستیاب ہونا بھی ایک مشکل امر تھا۔ تب مجھے اس کام کی دشواری کا اندازہ ہوا۔ تاہم اس کے باوجود میں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ اپنی تحقیق کے دوران انٹرنیٹ پر مختلف رسائل و جرائد کی تلاش کے دوران میرا سامنا ریختہ ویب سائٹ سے ہوا اور اس نے میری مشکل بڑی حد تک آسان کر دی جیسا کہ اس پر بے شمار قدیم و جدید رسائل و جرائد اپ لوڈ شدہ ہیں اور روز بروز ان کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ میں نے اس پر موجود تمام رسائل و جرائد کو کھنگال کر اپنے موضوع کے تعلق سے مضامین کو یکجا کرنا شروع کر دیا۔ دوران تحقیق میرے مشاہدے میں یہ بات آئی کہ گو کہ یہ تمام مضامین علم ترجمہ سے متعلق ہیں لیکن اس میدان میں بھی یہ مختلف و متنوع موضوعات کا احاطہ کر رہے ہیں جن کا تذکرہ تحقیق میں ضروری تھا تاکہ بعد میں یہ تحقیق کسی قاری، مصنف، مضمون نگار اور محقق کی مدد کا باعث بن سکے چنانچہ میں نے اپنے مشفق گائیڈ محترم کے مشورہ

سے ہر مضمون کا خلاصہ بھی لکھنا شروع کیا تاکہ قاری کو پورا مضمون پڑھنے کے بجائے صرف ایک صفحے سے ہی مضمون کے موضوعات کا اندازہ ہو جائے۔ان میں سے کئی موضوعات ایسے ہیں جن پر ابھی تک کوئی باقاعدہ کتاب نہیں لکھی گئی اور علم ترجمہ کا کوئی بھی شاگرد ان موضوعات سے صرف نظر کر کے آگے نہیں بڑھ سکتا۔اب ایک عام طالب علم سے ان موضوعات سے گزرنے کے لیے اتنے سارے رسائل و جرائد تلاش کر کے انہیں پڑھنے کی توقع نہیں کی جاسکتی چنانچہ ایسے علم ترجمہ کے کسی بھی طالب علم کے لیے میری یہ تحقیق انتہائی کارآمد ثابت ہو گی۔دوران تحقیق مجھے ایسے کئی موضوعات پر سیر حاصل مواد ملا جو اب تک میری نظر سے نہیں گزرے تھے۔ان کے علاوہ علم ترجمہ کے عمومی موضوعات پر بھی کافی تشفی بخش مواد ملا، کئی علمی بحثوں سے سامنا ہوا اور رفتار زمانہ کی تبدیلیوں کی وجہ سے ابھرنے والے نئے مسائل اور ان کا حل وغیرہ بھی نظر سے گزرے۔ان مضامین میں شامل چند موضوعات حسبِ ذیل ہیں۔

ترجمہ کی تعریف، ترجمہ کی اہمیت ، ترجمے کے ادارے جیسے فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، دہلی ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی، جامعہ عثمانیہ، انجمن ترقی اردو، اردو لغت بورڈ، اردو سائنس بورڈ، شعبہ تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی اور ادارہ فروغ قومی زبان وغیرہ، ترجمہ کے اداروں کی تاریخ، ترجمہ کے اداروں کی ضرورت، ترجمے کے تقاضے، ترجمے کے بنیادی اصول، مترجم کی ذمہ داریاں، ترجموں میں اصطلاحات کے مسائل اور ان کا حل، اصطلاحات میں یکسانیت ، مختلف شعبہ ہائے علوم کے تراجم میں اصطلاحات کا عمل و دخل، اصطلاحات سازی کی اہمیت، اصطلاحات سازی کے اصول، اردو میں اصطلاحات سازی کی تاریخ، کمپوزنگ کے مسائل، اردو کو سرکاری زبان بنانے کے لیے تراجم کی ضرورت، تراجم کے تئیں اہل زبان کا رویہ، انگریزی سے مغلوب ہو جانے کی روش کے فوائد و نقصانات، ترجمے کے نظریات، انسانی تہذیب کے ارتقا میں تراجم کا کردار، ترجموں میں محاورات، تشبیہات اور استعارات کے مسائل، ترجموں میں ضرب الامثال کے مسائل، گلوبلائزیشن اور ترجمہ، مشینی ترجمہ، ترجمے کے اقسام، طریقے اور تکنیک، نثری اور منظوم ترجمہ، اردو زبان میں ترجمے کی تاریخ، ترجمہ کے پھیلاؤ میں مذہبی کتب کا کردار، ترجمہ نگاری کا فن، فن ترجمہ :اصول و مبادی، ترجمہ نگاری کے حدود اور امکانات، ترجمہ کی تدریس، تدریس ترجمہ کا نصاب، ترجمہ میں مداخلت (تحریف و تغیر)، اردو میں فنی و سائنسی تراجم، مختلف تہذیبوں کے عروج میں تراجم کا کردار، ترجمہ اور ثقافت، صحافتی، دفتری، قانونی، علمی، سائنسی اور ادبی تراجم کے مسائل، موجودہ طرز معاشرت اور ترجمہ، ترجمہ بحیثیت تہذیبی اور لسانی مفاہمہ، ترجمے کے عملی مباحث، ترجمہ اور لسانیات، منظوم ترجمہ کا فن، مترادفات کا ترجمہ اور مسائل، ترجمے کی تجرید وغیرہ۔

محمد نعمان علی

فہرست ابواب

		صفحہ نمبر
	ابتدائیہ	05-09
باب اوّل	فنِ ترجمہ نگاری	10-32
باب دوّم	ترجمہ بحیثیت شعبۂ علم	33-51
باب سوّم	اشاریہ سازی کی اہمیت	52-74
باب چہارم	فن ترجمہ سے متعلق مضامین کا توضیحی اشاریہ	75-213
باب پنجم	حاصل مطالعہ	214-220
	کتابیات	221-226

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

سب سے پہلے میں خدا تعالیٰ کا شکر بجالاتا ہوں جس نے مجھے زندگی دی، اشرف المخلوقات میں پیدا کیا اور ایمان کی دولت سے نوازا اور میرے حق میں علم کی راہیں منور کیں۔ لاکھوں درود و سلام ہو پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفٰی ﷺ پر جن کی ذات اقدس رہتی دنیا تک ساری انسانیت کے لئے مشعل راہ ہے اور آپ ہی نے چودہ سو سال قبل مرد و عورت پر علم کے حاصل کرنے کو فرض قرار دیا تھا۔

انسان ابتدائی زمانے سے ہی تلاش و جستجو میں رہا ہے، جس کے نتیجہ میں وہ بہت سی کامیابیوں سے ہمکنار ہوا انسان کی اسی کاوش کو تحقیق کا نام دیا گیا ہے۔۔ میری تحقیق کا عنوان "اردو رسائل و جرائد میں ترجمہ سے متعلق شائع شدہ مضامین کا توضیحی اشاریہ" ہے۔ ویسے اردو زبان میں رسائل و جرائد کی اشاعت کا سلسلہ ڈیڑھ سو سال قبل شروع ہوا لیکن میری تحقیق کے مطابق ترجمہ سے متعلق شائع شدہ مضامین کا ایک بھی موضوعاتی توضیحی اشاریہ اب تک مرتب نہیں ہوا۔ چنانچہ میں نے اپنے گائیڈ محترم کے مشورے سے اس کام کو انجام دینے کا فیصلہ کیا۔ تاہم جب میں نے یہ کام ہاتھ میں لیا تو مجھے پتہ چلا کہ یہ ایک انتہائی مشکل کام ہے جیسا کہ میں نے بتایا کہ پچھلے ڈیڑھ سو سالوں میں اردو زبان کے سینکڑوں رسائل و جرائد شائع ہوئے جن میں کچھ ماہانہ، کچھ سہ ماہی اور کچھ ششماہی و سالنامے تھے۔ ان تمام کی تلاش، اور ان تک رسائی بے حد دشوار کن ثابت ہوئی جیسا کہ یہ برصغیر کے مختلف لائبریریوں اور تحقیقی اداروں میں موجود تھے۔ تاہم گائیڈ کی رہنمائی اور دیگر اساتذہ کے تعاؤن و مشورے سے میں تقریباً 5000 سے زائد رسائل و جرائد کو کھنگالنے کے قابل ہو ہی گیا اور میں نے نہ صرف ایک محقق کو اس رسالے سے متعلق معلومات دینے کی کوشش کی بلکہ ساتھ ہی اس مضمون کا ایک مختصر خلاصہ بھی دے دیا جس سے کسی قاری یا محقق کو مضمون کو سمجھنے میں مدد ملے۔

زیر نظر مقالہ کو چار ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلے باب کا عنوان ''**فن ترجمہ نگاری**'' ہے۔ اس باب میں ہم نے ترجمہ کی تعریف، ترجمہ کے نظریات اور اس کا تاریخی پس منظر، ترجمہ نگاری کے اغراض و مقاصد، اصطلاح سازی اور اس کے مسائل وغیرہ کو مختصراً بیان کیا ہے۔ دوسرے باب کا عنوان ''**ترجمہ بحیثیت شعبۂ علم**'' ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ترجمہ اب ایک باضابطہ شعبۂ علم بن چکا ہے چوں کہ یہ ایک بین شعبہ جاتی علم کا میدان ہے اس لئے اس کی عمومیت کا اعتبار کرتے ہوئے اس کو مطالعات ترجمہ کہا جا رہا ہے۔ اس باب میں ہم نے ترجمہ اور اس کے نظریات، توضیحات، اصول و قواعد، اطلاقات وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ تیسرے باب کا عنوان ''**اشاریہ سازی کی اہمیت**'' ہے۔ ہم تمام لوگ اشاریہ سازی کی اہمیت وافادیت سے واقف ہیں۔ اس سے ایک عام قاری اور مصنف کو سہولت فراہم ہوتی ہے، اس کا وقت مختلف رسالوں اور جرائد کی تلاش میں ضائع نہیں ہوتا، وہ بکھرے ہوئے اہم تصانیف اور مضامین میں سے فوری اپنے ہدف کو تلاش کر لیتا ہے۔ جہاں تحقیق کے ضمن میں کتابوں کی اپنی اہمیت ہے وہیں رسائل و جرائد میں چھپنے والے مضامین کی اہمیت بھی کتابوں سے کم نہیں ہے۔ جہاں کوئی کتاب بمشکل چند موضوعات کا احاطہ کرتی ہے وہیں رسائل و جرائد میں چھپنے والے مضامین انتہائی کم صفحات میں کئی متنوع موضوعات اور اصناف سخن کا احاطہ کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں جس سے کسی قاری یا محقق کو اس شعبہ علم کی وسعت و نوعیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ کبھی کبھار ایک مضمون اپنے مضمون نگار کی علمیت کی بناء پر کئی کتابوں پر بھاری ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں رسائل میں بدلتے وقت کے بدلتے تقاضوں کو سامنے رکھ کر مضامین لکھے جاتے ہیں جس سے اس شعبہ علم کی تازہ ترین صورتحال سے آگاہی ہوتی ہے اور اس سے تحقیق میں بڑی مدد ملتی ہے چونکہ علم کے مختلف گوشوں اور ان پر مختلف زاویوں سے متنوع تبصرے شامل ہوتے ہیں جو متنوع موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں اس لحاظ سے بھی یہ قاری کے علم میں گراں قدر اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ لہٰذا اس باب میں ہم نے اشاریہ سازی کی تعریف، اردو میں اشاریہ سازی کی تاریخ، اشاریہ سازی کے مقاصد، خصوصیات و فوائد، اشاریہ سازی کی قسمیں اور اسکے طریقہ کار پر سیر حاصل بحث مختلف حوالوں کے ساتھ کی ہے۔ چوتھے باب کا **عنوان ''فن ترجمہ سے متعلق مضامین کا توضیحی اشاریہ**'' ہے۔ یہ میری تحقیق کا اصل باب ہے۔ علم ترجمہ پر مضامین کی تلاش کے دوران میں نے تقریباً پانچ ہزار سے زائد رسالوں کا جائزہ لیا اور تقریباً ایک سو ساٹھ (۱۶۰) مضامین کو یکجاء کیا اور ان میں سے باسٹھ (۶۲) مضامین کا تفصیلی اشاریہ گائیڈ محترم کے مشورہ سے اس کی اہمیت ندرت اور موضوع سے مطابقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس مقالے میں شامل کئے گئے ہیں جو کہ فن ترجمہ نگاری کے مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں ۔ دوران تحقیق مجھے محسوس

ہوا کہ کسی بھی موضوع کے متعلق تحقیق میں صرف اس موضوع کی کتابیں یا مخطوطات ہی کارآمد نہیں ہوتے بلکہ اس موضوع سے متعلق ان گنت مضامین ہوتے ہیں جو مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہوتے ہیں اور ان تک ایک محقق کی رسائی مشکل ہوتی ہے ایسے میں اگر ان کا موضوعاتی اشاریہ تیار ہو جائے تو پھر کیا کہنے، محقق کے لیے الہ دین کا چراغ ہاتھ آجاتا ہے، وہ ایک ایسے بحر ذخار سے ہمکنار ہو جاتا ہے جہاں اسے علم و فن کے ہر موتی تک دسترس حاصل ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ، محقق کو رسائل و جرائد میں شائع شدہ مضامین سے موضوع کے بین شعبہ جاتی نوعیت و وسعت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ہر محقق کے لیے عملی طور پر یہ ممکن نہیں کہ وہ دنیا بھر میں چھپنے والے تمام رسائل تک رسائی حاصل کر سکے اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ وہ ان تمام کو پڑھ سکے چنانچہ اس صورت میں رسائل و جرائد کا موضوعاتی اشاریہ اس کے لیے انتہائی مفید ثابت ہوتا ہے جن کی مدد سے وہ ان رسائل و جرائد تک رسائی حاصل کر سکتا ہے جس میں اس کے اپنے تحقیقی موضوع پر مضامین شائع ہوئے ہوں۔ جہاں تک اردو زبان کی بات ہے، پچھلے ڈیڑھ سو سال سے تقریباً برصغیر کے ہر ضلع سے مختلف رسالے و جرائد شائع ہو رہے ہیں جن کی موجودہ تعداد ہزاروں میں پہنچتی ہے ایسے میں کسی محقق کے لیے ان سے استفادہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ان رسائل و جرائد کا اشاریہ ترتیب نہ دیا جائے۔ اس لحاظ سے بھی اشاریے کی اپنی اہمیت و افادیت ہے۔ گو کہ فی زمانہ بہت سے رسائل و جرائد کی کاپیاں آن لائن دستیاب ہیں لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ ہونے سے ان سے استفادہ بہت مشکل ہے۔ پھر اشاریہ سازی کی بھی اپنی مشکلات ہیں۔ اشاریہ مرتب کرنے والوں کے سامنے ہمیشہ یہ سوال رہتا ہے کہ کن معلومات کو لیا جائے اور کن معلومات کو چھوڑ دیا جائے، پھر یہ کس محقق کے لیے کون سی معلومات کارآمد ہوں گی وغیرہ۔ چنانچہ اشاریہ سازی اپنے مرتبین کی ذہانت و دانشمندی کا بھی امتحان ہوتا ہے۔ ابھی تک چونکہ اردو زبان میں اشاریہ سازی کا بہت کم کام ہوا چنانچہ اس میں نقوشِ راہ بھی کم ملتے ہیں۔ خاص طور پر موضوعاتی اشاریہ سازی تو نہ کے برابر ہے چنانچہ ہم نے اپنی بساط اور تگ و دو کے ذریعہ زیر نظر تحقیق میں، میں نے درج ذیل معلومات ایک جدول کی شکل میں فراہم کیں تاکہ قاری یا محقق کو فوری طور پر کسی رسالے یا جریدے میں شائع شدہ مضمون سے متعلق معلومات دستیاب ہو جائیں۔

مضمون کا عنوان:	
مضمون نگار:	رسالہ کا نام:
صفحہ نمبر:	جلد نمبر: شمارہ نمبر:
دورانیہ:	سنہ اشاعت:
مقام اشاعت:	مطبع:
ناشر:	ایڈیٹر:

اس کے علاوہ میں نے ان شائع شدہ مضامین کا خلاصہ بھی پیش کیا ہے تاکہ اس مضامین میں شامل مواد کی بھی معلومات مل جائیں۔ ان تمام معلومات کو اکٹھا کرنا ایک دقت طلب کام تھا تاہم اپنے گائیڈ کی زیر نگرانی میں نے اس سے عہدہ برآ ہونے میں الحمدللہ کامیاب کوشش کی ہے۔

شکریہ ادا کرنا مقالہ نگار کا ایک اہم فریضہ ہے سب سے پہلے میں اللہ رب العزت کا شکر بجالاتا ہوں جس نے مجھے حصول تعلیم اور مقالہ لکھنے کی توفیق عطا فرمائی اور اسی کے رحم و کرم سے میں نے اپنا مقالہ مکمل کیا۔ اس مقالہ کی تکمیل کے سلسلہ میں جن حضرات کا تعاون پیش رہا ان میں سب سے پہلے میں اپنے نگراں اور استاد محترم **ڈاکٹر محمد جنید ذاکر** صاحب کا بے حد شکر گزار و ممنون ہوں کہ انہوں نے مقالہ کی تیاری میں برابر میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ میں ان کی پر خلوص محبت سے ہمیشہ متاثر رہا ہوں۔ تحقیق کے دوران جب بھی دقتیں پیش آئیں میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا انہوں نے اپنی تمام مصروفیت کے باوجود مجھے گراں قدر صلاح و مشوروں سے نوازتے رہے اور مواد کی رسائی کے سلسلے میں آپ نے بڑی ہی شفقت اور مخلصانہ رویہ کے ساتھ میری رہنمائی فرمائی۔ میں ان کے حق میں دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت انھیں جزائے خیر عطا فرمائے (آمین)۔

گائیڈ محترم کے علاوہ ڈپارٹمنٹ کے دیگر مشفق اساتذہ کو بھی میں کبھی نہیں بھول پاؤں گا جنھوں نے ہر قدم پر مجھے اپنا تعاؤن دیا۔ شعبہ کے صدر پروفیسر خالد مبشر الظفر، شعبہ کے سابق صدر پروفیسر محمد ظفر الدین، شعبہ کے دیگر اساتذہ

ڈاکٹر فہیم الدین، ڈاکٹر محمود کاظمی اور ڈاکٹر کہکشاں لطیف ان تمام نے ہر قدم پر میری مدد کی۔ ان کی قدم بہ قدم رہنمائی اور حوصلہ افزائی نے مجھے اس تحقیق کو مکمل کرنے میں مدد دی۔ شعبہ کے غیر تدریسی ارکان کا بھی مجھے ہمیشہ تعاؤن حاصل رہا۔ اس کے علاوہ اس موقع پر میں اپنے والدین و اہلیہ اور ان تمام افراد کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اس مقالے کی تکمیل میں میری مدد کی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان تمام پر اپنی رحمتیں برسائے اور انھیں ہمیشہ خوش و خرم و شاداب رکھے اور میرے اس تحقیقی مقالے کو محققین کے لیے کارآمد بنائے۔

مجھے اعتراف ہے کہ یہ موضوع اپنی وسعت کے لحاظ سے کافی بڑا ہے۔ یہ ایک میری طالب علمانہ کوشش ہے اور میں نے حتی المقدور اپنے موضوع سے انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ چوں کہ تحقیق میں کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی لہٰذا میری اس تحقیق کو میں اپنی آخری منزل نہیں سمجھتا۔

محمد نعمان علی

☆☆☆

باب اوّل

فنِ ترجمہ نگاری

فنِ ترجمہ نگاری

ترجمہ کے نظریات

نظریہ عربی لفظ ہے۔ جس کے لفظی معنی دیکھنا ہیں۔ نظریہ سے مراد یہ ہے کہ کسی بھی درپیش معاملہ میں کیا رائے ہے یا اُسے فرد کس نظر سے دیکھتا ہے۔ دراصل نظریہ کا تصور یونانی فلسفہ سے آیا ہے جہاں اسے تھیوری کہا جاتا تھا اور اس کا اصل مطلب کسی شئے کو ناظر اپنی مخصوص نظر سے دیکھتا ہے مگر فلسفہ میں اسے غور و فکر یا قیاس گردانا جاتا ہے۔ انگریزی میں نقطۂ نظر کو Point of view کہا جاتا ہے۔ اور اردو میں نظریہ کے مترادف الفاظ دھیان، سوچ، تفکر، نظر و فکر وغیرہ ہوتے ہیں۔ نظریہ کی وضاحت وکی پیڈیا میں یوں ملتی ہے:

> "Theory is a contemplative and rational type of abstract (or) generalising thinking or the results of such thinking depending on the context. The results mights for example include generalised explanation of how native works".

یعنی نظریہ بنیادی طور پر ایک تصور ہوتا ہے یا وہ ایک فرض قسم کی دلیل ہے یا ایک عمومی فکر ہے یا اس خیال کا نتیجہ ہوتا ہے جو سیاق و سباق پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ نتیجہ مثال کے لئے بھی ہو سکتا ہے جو اصل فعل یا کام کی وضاحت کے لئے ہو۔ یا نظریہ خیالات یا تصورات یا فکر کے آغاز و ابتداء کا نام ہے۔

نظریہ کا لفظ فرانسیسی لفظ آئیڈیالوجی کا ترجمہ ہے۔ اس میں دو لفظ ہیں۔ آئیڈیا اور لوجی۔ اس کا مفہوم اندازِ فکر اور تصورِ حیات ہوتا ہے۔ عام طور پر نظریہ اس معاشرتی لائحہ عمل کو بھی کہا جاتا ہے جو کسی قوم کا مشترکہ نصب العین ہوتا ہے۔ اور یہ لفظ بہت وسیع معانی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اس لفظ کی اثر انگیزی کا انحصار افراد کے خلوص، لگن اور وفاداری و

وابستگی پر ہوتا ہے اور اسی اعتبار سے کسی نظریہ یا نظریات کو تقویت ملتی ہے۔ نظریہ دراصل افکار و خیالات کا عکاس ہوتا ہے اور یہ طرزِ فکر کے اصول متعین کرتا ہے۔ اس کی جگہ اصولی مسئلہ، بنیادی فکر اور نصب العین وغیرہ الفاظ بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔

عام طور پر نظریہ لفظ کی نسبت کسی ملک، شخصیت، علم اور ادارہ وغیرہ کی طرف کی جاتی ہے۔ جیسے ہندوستانی نظریہ یا ہندوستانی نظریات، نظریہ پاکستان، کارل مارکس کا نظریہ، مولانا آزاد کا نظریہ تعلیم، علامہ اقبال کا نظریہ، فلسفیانہ نظریات اور دو قومی نظریات وغیرہ۔ اور اسی اعتبار سے اس ملک، شخصیت، علم، موضوع، مواد وغیرہ کے بنیادی تصورات سے بحث کی جاتی ہے۔

نظریہ کے دیگر مفاہیم بھی ہو سکتے ہیں جیسے:

☆ وہ اصول جنھیں حقائق کی تشریح کے لئے وضع کیا گیا ہو۔

☆ وہ بیان جو وسیع پیمانے پر ماحول کی پیش قیاسی کے لئے استعمال کیا جائے۔

☆ آرٹ یا سائنس کی وہ قسم ہے جس کے بیانات مسلمہ اصول پر مبنی ہوں۔

☆ وہ ضابطے جو باضابطہ نقطۂ نظر کی تشکیل انجام دیتے ہوں۔

☆ وہ تصور جس کے واسطے سے پیچیدہ نظام کو سمجھنا آسان ہو۔

☆ فطرت کا قانون۔

☆ عمومی نظریہ جو فطرت کے حقائق کو بیان کرے۔

ان سب کے علاوہ موجودہ دور میں نظریہ کی اصطلاح کا مفہوم بہت زیادہ وسیع معنی میں پھیل چکا ہے۔ اور مختلف قسم کے معنی میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ دلائل سے ثابت شدہ مفروضہ کو نظریہ کہا جاتا ہے۔ عملی اور تجرباتی دلائل کا استعمال نظریات کو ثابت کرنے کے لئے کیا جاتا ہے لیکن یہ بات بھی اہمیت کی ہے کہ نظریات ہمیشہ درست اور حق یا حتمی اور قطعی ہوں یہ ضروری نہیں۔ حالات اور مواقع کے اعتبار سے اس میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہیں اور یہ صحیح یا غلط ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی سرگرم اور فعال شئے کے لئے اس کے اصول و ضوابط اور نظریات اہم ہوا کرتے ہیں۔ نظریاتِ ترجمہ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ جو شخص ترجمہ کرتا ہے کہ اس کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ ترجمہ کے سارے

نظریات سے مکمل طور پر واقف ہو اسی طرح جو ترجمہ کے اساتذہ ہیں ان کے لئے بھی یہ بات ضروری نہیں کہ وہ ترجمہ کے نظریات پر مشتمل مکمل معلومات رکھتے ہوں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ایک اچھا مترجم وہ ہوتا ہے جس کو کم از کم ترجمہ کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ دونوں زبانوں پر عبور رکھتے ہوئے نظریاتِ ترجمہ کی بنیادی، ضروری اور اہم باتیں معلوم ہوں۔ اساتذہ جو طلبہ کو ترجمہ کے بارے میں معلومات بہم پہنچاتے ہیں اگر وہی نظریاتِ ترجمہ سے نابلد ہوں گے تو وہ درست طریقہ سے طلبہ کو ترجمہ کے بارے میں مکمل معلومات بہم نہیں پہنچا سکیں گے اور اس کے نتیجہ میں اچھے مترجمین پیدا نہ ہوں گے۔ اسی طرح مترجم کے لئے بھی ترجمہ کے بنیادی نظریات کو جاننا ضروری ہے تاکہ وہ ان کی روشنی میں ترجمہ سے انصاف کر سکے۔

ترجمہ کے نظریہ کی تعریف:

ترجمہ یقیناً ایک سرگرمی ہے اور ترجمہ کے نظریہ میں وہ تمام باتیں شامل ہیں جو اس سرگرمی کو بہتر اور معیاری بناتی ہیں۔ جیسے مترجم کا مقصد، غرض و غایت، نوعیت، اقسام، عناصر، تاریخ، طریقہ کار، طرز کے اصول، قاعدے، کیفیات، آداب، مترجم کے اوصاف، مترجم کے فرائض اور اس کی ذمہ داریاں، حقوق، تدریس، اکتساب، ماحول، معیارات، جانچ، نتائج، آلات و وسائل، مسائل و مشکلات، تجزیہ و تحقیق اور غور و فکر پر مبنی دلائل وغیرہ یہ تمام ضروری امور اس میں داخل ہیں۔ اس لئے کہ ترجمہ کے یہی وہ نظریات ہیں جو موثر کردار ادا کرتے ہیں اور یہ تمام وہ باتیں ہیں جو ارسال و ترسیل یا پیغام کی منتقلی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور ترجمہ کے نظریات سے متعلق زبانوں کے مختلف الفاظ کے پوشیدہ مفہوم اور اس کے درست انطباق میں مدد ملتی ہے اور ترجمہ کے اصول، معنوی مطابقت، فصاحت و بلاغت اور ربط و ارتباط سے بحث ہوتی ہے۔

ترجمہ کے نظریات کے ذیل میں دو باتیں نہایت اہمیت کی حامل ہوا کرتی ہیں۔ ایک یہ کہ اصل زبان کے متن (لفظ، فقرے، جملے) کا معنی و مفہوم اور اس کی منتقلی کا مقصد ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ترجمہ ہونے کے باوجود بھی اس میں ترجمہ پن نہ جھلک پائے۔ یعنی اس قدر ترجمہ سلیس اور رواں ہو کہ اس میں اصل کی سی کیفیت محسوس ہونے لگے اور کسی بھی طرح الگ سے ترجمہ کا احساس نہ ہو۔ اس بات میں جا بجا تکلف محسوس نہ ہوتا ہو اور دشواریاں نہ ہوں اور ترجمہ پڑھنے سے ایک طرح کا لطف ملتا رہے۔ اور یہ بھی خیال ہے کہ پڑھنے سے ترجمہ، ترجمہ معلوم ہو۔

دراصل ہندوستان ایک ہمہ لسانی اور کثیر ثقافتی ملک ہے۔اس متنوع ماحول نے ترجمہ کے راستوں کو ہموار کیا ہے اور ابتداء ہی سے اس سے متعلق غور و فکر کرنے اور اسے پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ابتداء میں تو یہ سلسلہ یوں ہی آگے بڑھا لیکن 1970ء کے بعد باضابطہ چند اداروں میں ترجمہ کے رجحان میں تبدیلی کے پیش نظر مطالعات ترجمہ کے مضمون کو رکھا گیا اسی لئے ترجمہ کے نظریات یہاں فروغ پائے اور یہ ترجمہ کے نظریات عملی موضوعات سے وابستہ ہیں۔ البتہ قدیم زمانے میں کلاسیکی زبانوں میں جو ترجمہ ہوا کرتا تھا اس نظریہ کے چند مضمرات اس طرح ملتے ہیں۔

(1) مترجم سایہ کی طرح متن کی اتباع کرے۔

(2) سایہ، سایہ ہوتے ہوئے اپنی اصل شئے سے مختلف ہوا کرتا ہے۔

(3) ترجمہ، ہیئت اور شکل کے اعتبار سے الگ ہو سکتا ہے۔

بعض علمائے ادب کے مطابق ترجمہ کا نظریہ مختلف زبانوں کے درمیان ایک طرح کا تعلق ہوتا ہے اور یہ تقابلی لسانیات کی ایک شاخ ہے اور بھی اس طرح کے دیگر خیالات پائے جاتے ہیں لیکن ان سب میں اہم بات یہ ہے کہ ترجمہ کے نظریہ کو ترجمہ کے عمل اور ماحصل کی وضاحت ضرور کرنی چاہئے اور اس کو توضیحی بنانا چاہئے۔ترجمہ ہر زبان کا ایک جزو لاینفک ہے جس کو کسی بھی دور میں الگ نہیں کیا جاسکا۔ایک رومی نژاد فرد ایرک جیکب سن نے ترجمہ کے نظریات سے متعلق تین اہم باتیں ذکر کی ہیں۔

(1) یک لسانی ترجمہ (Intralingual Translation) (کسی زبان کی علامتوں کی اس زبان میں بازلفظی)۔

(2) بین لسانی ترجمہ: کسی زبان کی علامتوں کی دوسری زبان کی علامتوں میں بازلفظی۔

(3) کسی زبان میں علامتوں کی غیر حرفی علامتی نظاموں میں تبدیلی یا منتقلی۔اس ماہیتِ قلب کو تبدیلی یا ہیئت سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

ترجمہ کے جدید نظریہ کا آغاز ساختیات سے ہوتا ہے جس کا اثر تمام زبانوں پر پڑا ہے اور دنیا میں جتنی زبانیں پائی جاتی ہیں اتنے ہی نظریات کا پایا جانا ممکن ہو سکتا ہے اسی لئے 1975ء میں کئے گئے شمار کے مطابق ان کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہے۔ترجمہ کے نظریہ میں بہت سی باتیں اہمیت کی حامل ہوا کرتی ہیں جیسے متنی لسانیاتی سطح ہے کہ جس میں مترجم کے فہم اور ادراک سے بحث ہوتی ہے۔علاوہ ازیں سماجی منطقی سطح بھی ہوتی ہے کہ اس سطح پر ترجمہ کا ہدف، غرض و غایت، حتمی

مدت ،صارف اور معاہدہ وغیرہ پر مباحث ہوتے ہیں۔ ترجمہ کے نظریات میں ثقافتی سطح بھی اہم ہوتی ہے کہ جس میں نظریاتی عوامل،اقتدار سے تعلقات اور ثقافتی عمل ارتقاء کے تصورات ہوتے ہیں۔

ترجمہ کے نظریات کا تاریخی پس منظر:

ابتداء میں ترسیلِ خیال اور ابلاغِ فکر کے پیش نظر صرف تراجم ہی ہوتے رہے اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ترجمہ کا نظریہ تقریباً ہزار سال تک تراجم اور اس سے متعلق سرگرمیوں تک ہی محدود رہا اس طرح کی صورتِ حال 1949ء تک ہی رہی ۔ ترجمہ کے علم کا آغاز بھی 1940 ء کے بعد ہوا۔ پھر اس میں زبردست قسم کی تبدیلیاں لائی گئیں۔ سیسرو Cicero سے مونابیکر کے عہد تک علم ترجمہ اپنے ارتقائی مدارج ہی طئے کر رہا تھا۔ تراجم کی جانچ کا معیار کیا ہو؟ مترجمین کو اپنے فن کے بارے میں کیا کہنا ہے؟ مترجمین نے کس طرح کی سفارشات پیش کیں یا کیسے پڑھایا اور سکھایا؟ یہ ساری بحثیں انھیں کے عہد سے متعلق ہیں یہ اور اس طرح کے بہت سے سوالات کے جوابات بھی ہمیں اس میں ملتے ہیں ۔مزید یہ کہ جارج اسٹینر نے اپنی کتاب Aftec Basel میں ترجمہ کے نظریہ ،تاریخ وغیرہ کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے ۔اس کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

دورِ اوّل:

اس دور اول کی شروعات رومیوں سے ہوتی ہے۔ ہوریس اور سیسرو نے ترجمہ سے متعلق اپنے خیالات میں لفظی ترجمہ اور مفہوم پر مبنی ترجمہ کی وضاحت کی ہے۔اس میں یہ سوال بھی زیر بحث آیا کہ بہتر ترجمہ کس کو قرار دیا جائے؟ ترجمہ میں اصل زبان کی جو خوبیاں ہیں وہ محسوس ہونی چاہئیں اور وہ صاف طور پر سمجھ میں آسکے۔ ترجمہ اصل کام کی نقل ہے۔ ترجمہ کا اسلوب اصل کے مطابق ہو اور یہ کہ اصل متن کے مطابق بے ساختہ ہو۔

دورِ دوّم:

اس دور کے اولین نظریہ سازوں میں سے ایک انسانیت پسند فرانسیسی ایطنے ڈولے نے 1940ء میں ترجمہ کے اصول کے بارے میں ایک مختصر مضمون لکھا تھا جس کا عنوان یوں تھا"ایک زبان سے دوسری زبان میں بہتر ترجمہ کس طرح کیا جاسکتا ہے؟"۔اور پھر اس نے پانچ اصول وضع کئے جو درج ذیل ہیں:

1) یہ ضروری ہے کہ مترجم اصل مصنف کے منشاء و مفہوم کو اچھی طرح سمجھ لے۔ اسے غیر واضح امور کی وضاحت کا اختیار حاصل ہے۔

2) مترجم کو اصل اور ہدفی زبانوں پر مکمل طور پر عبور حاصل ہو۔

3) مترجم لفظ کے بدلے لفظ رکھنے سے احتراز کرے۔

4) ترجمہ میں وہ طرز اپنائے جو عموماً مستعمل ہو۔

5) مترجم لفظوں کے انتخاب اور ترتیب میں مناسب طریقہ اختیار کرے تاکہ درست کیفیت پیدا ہو۔

یہ مذکورہ بالا اصول چوں کہ جامع اور بہت مختصر ہیں اس لئے انھیں کافی اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ اسی طرح بعد کے زمانے میں ہومر (Homer) نے انھیں اصول اور خیالات کو پیش کیا اور وہ بھی اس بات کا قائل تھا کہ لفظ کے مقابلہ میں لفظ نہ رکھا جائے اور مترجم اصل کی روح اور حقیقت تک پہنچے اور یہ کہ اپنے ترجمہ کی اساس وہ مضبوط علمی جد و جہد اور درست تحقیق پر رکھے جس میں دیگر پہلو اور تشریحات کا احاطہ بھی کیا جاسکے۔ اسی طرح جان ڈارون نے بھی ترجمہ سے متعلق اپنے نظریات اور اصول کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

دورِ سوّم:

ترجمہ کے اس تیسرے دور کا آغاز 1940ء میں مشینی ترجمہ کے موضوع پر شائع ہونے والے ان مقالوں سے ہوتا ہے جو اولین کہلاتے ہیں۔ اس دور میں خصوصاً ساختیات، لسانیات، تشکیلات، نحو اور تقابلی مطالعات وغیرہ شعبوں کا ارتقاء عمل میں لایا گیا۔ اس دور کو بھی اگر دو حصوں میں تقسیم کیا جائے تو اس کا پہلا دور 1949 ء سے 1954ء تک ہے اور دوسرا دور مشینی ترجمہ کی ابتدائی کوششوں اور وسائل سے ہوتا ہے۔

دورِ چہارم:

ترجمہ کا یہ دور بھی خصوصیت کے ساتھ نہایت اہمیت کا حامل ہے جس میں ترجمہ کا دائرہ بڑھ کر وہ مستقل ایک شعبہ علم بن گیا۔ اس میں شک نہیں کہ ترجمہ کا اصل تعلق لسانیات سے ہے۔ لیکن اس کا تعلق علم کے دیگر شعبہ جات سے بھی ہے اور یہ رشتہ روز بہ روز مضبوط و مستحکم ہوتا جارہا ہے۔ عصرِ حاضر تو ترجمہ کے نظریات کے حوالہ سے کافی زرخیزی کا حامل نظر آتا ہے جس میں ترجمہ کے الگ الگ نظریات ملتے ہیں۔ عصرِ حاضر میں کثیر نظامی نظریہ وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

ترجمہ کے باب میں اولین اور منظم انداز میں کوشش کرنے والوں میں عربوں کا کردار نہایت ممتاز رہا ہے چنانچہ بنوامیہ، بنوعباس اور مامون رشید کا دور اس کا درخشاں دور کہلاتا ہے۔ مامون رشید نے بطورِ خاص 830ء میں ایک اعلیٰ ترین اسلامی ادارے" بیت الحکم" کی بنیاد رکھی۔ یہ ادارہ علم و ادب اور ترجمہ کا ایک مرکز ثابت ہوا جہاں سے مترجمین وابستہ رہے۔ اس ادارہ نے لفظی ترجمہ کا طریقہ کار اپنایا تھا اسی لئے ہر یونانی لفظ کی جگہ عربی لفظ رکھا جاتا۔ لفظی ترجمہ بجائے خود درست ہو مگر یہ ہر جگہ کامیاب نہیں ہوتا ہے اسی طرح دوسرا طریقہ کار مفہوم پر مشتمل ترجمہ تھا جس کی بدولت سلیس اور رواں تراجم حاصل ہوئے۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر ابن اسحاق اور ان کے تلامذہ نے ہمیشہ اپنے قارئین کو مدّ نظر رکھا کہ وہ قارئین کے لئے قابل قبول ہو جائے۔

غرض موجودہ دور میں ترجمہ کے بہت سے نظریات ملتے ہیں جو لسانیات سے وابستہ ہیں اور یہ سارے نظریات اپنے مخصوص پس منظر میں نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ اس طرح ترجمہ اور اس کے نظریات کا کینوس عہدِ حاضر میں وسیع سے وسیع نظر آتا ہے۔

فن ترجمہ نگاری:

فن عربی زبان کا لفظ ہے جس کی جمع فنون ہے۔ یہ لفظ انسان کے کسی ہنر کے لئے استعمال ہوتا ہے اور فنیات کا مطلب سائنس کے برعکس وہ علوم ہوتے ہیں جن میں انسان کی اپنی فطری صلاحیت قوتِ اختراع اور جمالی طبیعت کا دخل حاوی ہوتا ہے۔ اس طرح فن ترجمہ نگاری کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مترجم اپنی فطری صلاحیت، قوت اختراع اور جمال طبیعت کے دخل کے ساتھ جملہ نزاکتوں اور باریکیوں کی رعایت کرتے ہوئے ترجمہ کا عمل انجام دے۔

ترجمہ ایک فن ہے جس میں ایک زبان کے مواد کو دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے۔ ترجمہ کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں جیسے ایک تعریف یہ کی گئی ہے کہ کسی بھی زبان کی تحریر کو دوسری زبان میں منتقل کرنا ترجمہ کہلاتا ہے یعنی کسی بھی زبان کی عبارت کے معنی و مطلب کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنا کہ اصل عبارت کی خوبی اور مطلب دونوں برقرار ہوں۔ دوسری تعریف یہ ہے کہ کسی مصنف کے خیالات کو لیا جائے۔ ان کو اپنی زبان کا لباس پہنایا جائے۔ ان کو اپنے الفاظ و محاورات کے سانچہ میں ڈھالا جائے اور اپنی قوم کے سامنے اس انداز سے پیش کیا جائے کہ ترجمہ اور تالیف میں کچھ فرق معلوم نہ ہو۔ ایک اور تعریف یوں ملتی ہے کہ مترجم کا کام صرف دوسری زبان میں (مواد کو) منتقل کرنا ہے اور یہ

کوئی بڑا کام نہیں۔ بعض حضرات نے ترجمہ کو تخلیق گردانا ہے اور مکھی پر مکھی مارنے کی نفی کی ہے۔ اسی طرح رائٹرس کانفرنس، اکادمی ادبیات پاکستان (۱۹۸۳) میں ترجمہ کی تعریف یوں کی گئی۔

"ترجمہ کا عمل ایک علمی و ادبی پیکر کو دوسرے پیکر میں ڈھالنا ہے اور وہ بھی اس احتیاط و خوبی سے کہ اس کا ڈیل ڈول، شکل و شباہت، ناز و انداز اور جزئیات و خیالات پورے طور پر منتقل ہو جائیں۔" [۱]

اس طرح ترجمہ کی مختلف تعریفات ملتی ہیں جن میں ایک بنیادی بات یہ ہے کہ ایک زبان کے مواد کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کے لئے مترجم کو دونوں زبانوں پر بہ یک وقت قدرت ضروری ہے۔ بعض تراجم اسی لئے بے وقعت ہوتے ہیں کہ دونوں زبانوں پر مترجم کو بہ یک وقت دسترس نہیں ہوتی جس کے نتیجہ میں ترجمہ کی نزاکتیں ملحوظ نہیں ہوتیں اور زبان سے مکمل طور پر عدم واقفیت کی وجہ سے تراجم کا حق ادا نہیں ہو پاتا۔ ترجمہ کے عمل میں زبان و بیان، لفظیات، تراکیب، تشبیہات، استعارات، رمز و کنایات اور بین السطور کی باتوں کو منتقل کرنا نہایت مشق اور ریاض کا تقاضہ کرتا ہے اسی طرح زبان اور زبان کے فن کاروں کے تہذیبی، سماجی و تمدنی، ثقافتی، مذہبی، تاریخی و جغرافیائی پس منظر سے واقفیت ضروری ہوتی ہے۔ زبانوں کی لسانی خصوصیات اور نحوی و صرفی تراکیب سے حد درجہ قربت و مانوسیت از حد اہم ہوتی ہے تبھی معانی و مفاہیم کے نئے ابھار بھی روشن ہوتے ہیں اور چوں کہ ہر زبان کی اپنی لسانی خصوصیات ہوتی ہیں جن پر گہری نظر رکھنا مترجم کے لئے بے حد اہمیت کا حامل اور ضروری ہوتا ہے۔ خاص طور پر اصل زبان سے ہدفی زبان میں مواد کی منتقلی کے دوران متبادل و مناسب اور متوازن الفاظ و تراکیب یا لفظیات و تعبیرات میں مترجم کو غیر معمولی تیز دماغی، بیدار مغزی اور مکمل صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے کام لینا پڑتا ہے۔ ان ساری باتوں سے ایک اہم بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ ایک زبان کے مواد کو دوسری زبان میں منتقل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے اس کے لئے بہت ساری خصوصیات اور نزاکتوں کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے لیکن اس کے ساتھ ایک بات یہ بھی اہم ہے کہ مترجم معنی اور مفہوم میں کوئی غیر ضروری یا غیر مناسب تبدیلی نہ کرے اس لئے کہ اصل ترجمہ جو ہوتا ہے وہ لفظ کا نہیں بلکہ مفہوم کا ہوتا ہے اس لئے مترجم اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کر سکتا البتہ یہاں اس موضوع پر بھی " ترجمہ میں مداخلت" کے عنوان سے تھوڑی بحث کی جائے گی تاکہ ترجمہ میں اس عمل سے مترجم کو کس طرح گزرنا پڑتا ہے، اس بات کی مناسب وضاحت ہو جائے۔

ترجمہ میں نثر اور شاعری دونوں شامل ہیں مگر شاعری کی بہ نسبت نثر کا ترجمہ قدرے آسان عمل ہوتا ہے۔ نثر میں تقریباً وضاحت ہوتی ہے جب کہ شاعری میں رمز و کنایات، اشارات و ابہام اور بین السطور مضمون بھی ہوتا ہے۔ شاعری کے ترجمہ کا اصل مقصد اظہارِ جذبات و کیفیات ہوتا ہے اس لئے مترجم جیسی دلکش اور رواں زبان میں مرکزی خیال کی عکاسی کرے گا تاثر اتنا ہی ہمہ گیر ہو جائے گا۔ ترجمہ کی ہیئت بھی موضوع و مواد کے تقاضہ کے مطابق ہونی چاہئے۔ اسلوب، تکنیک اور ہیئت وغیرہ سبھی کچھ متن کی ضرورت کی مطابقت سے مانوس اور موزوں ہوں جس میں اصل فن پارے کا حسن، اثر دار توانائی پوری طرح موجود رہے۔ ترجمہ میں مرکزی خیال کے ساتھ ساتھ ماحول کی صداقت پر توجہ دینا بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔ اگر اصل نظم کا ماحول افسردہ ہے تو ترجمہ میں بھی ماحول افسردہ ہی ہونا چاہئے یہ نہ ہو کہ ترجمہ کرتے وقت افسردہ نظم کا ماحول شادمانی کی فضا میں تبدیل ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسا ترجمہ ناقص ہی ہوگا اس لئے ترجمہ میں قاری کو وہی اندازِ ابلاغ اختیار کرنا چاہئے جو مصنف، ادیب یا شاعر کا اصل مقصد، منشاء، خیال یا تاثُر تھا۔ اس طرح ترجمہ میں وہ تمام خصوصیات ہوں جن کی توقع ایک اعلیٰ تخلیق سے کی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے اعلیٰ ترجمہ کی خصوصیات اس طرح بیان کی ہیں:

> "ایک اعلیٰ درجہ کا ترجمہ شاعر یا مصنف کے مرکزی خیال یا جذنے کا امین اور عکاس ہوتا ہے ۔اس کی زبان، تکنیک، اسلوب، ہیت، موضوع و مواد کے عین مطابق ہوتی ہے۔ ترجمہ کی زبان نئی اور دلکش ہوتی ہے نیز ادبی سرمایہ میں اضافہ کرتی ہے اس سے قارئین کو توجہ کا مرکز بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ منظوم ترجمہ میں جمالیاتی کیفیت اور شعریت بھی ہوتی ہے اس طرح ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترسیلِ خیال یا انتقال فکر کا سادہ عمل ہوتے ہوئے بھی پیچیدہ اور محنت طلب عمل ہے جس کے لئے تخلیقی دیانت، تنقیدی بصیرت اور تخلیقی صلاحیت کی ضرورت ہے مترجم اگر ان اوصاف سے محروم ہے۔ اور وہ اپنے فرائض کی ادائیگی سے قاصر رہتا ہے تو اٹلی کی ضرب المثال کے مصداق ایسا ٹرانسلیٹر (Translator) ٹریٹر (Traitor) ہوتا ہے"۔[۲]

اس لئے خاص طور پر ترجمہ ایسا ہونا چاہئے کہ اس میں مصنف کے لہجے کی کھنک اور آہنگ بھی باقی رہے۔ اپنی زبان کا مزاج بھی بنیادی طور پر موجود رہے اور ترجمہ اصل متن کے مطابق بھی ہو۔ ترجمہ کی یہ شکل سب سے زیادہ مشکل ہے۔ ایسا

ترجمہ جس میں مترجم نے مصنف کی اصل روح کو پاکر اپنی زبان میں نگینے کی طرح بٹھادیا ہو ایک ایسا گوہر نایاب ہے جسے ادب کا شہہ پارہ جو کبھی کبھار وجود میں آکر کسی تہذیب کی ساری روح کا مظہر بن جاتا ہے۔ ترجمہ کے اسلوب، زبان و بیان ،لفظ و معانی ان سب سے نثر میں وضاحت، قطعیت، سادگی اور روانی پیدا ہوتی ہے اس لئے یہ دیکھا جاتا ہے کہ مترجم ترسیلِ خیال میں کس حد تک کامیاب ہے۔

یہ باب" ترجمہ نگاری کے فن" سے متعلق ہے اس لئے ترجمہ نگاری کی بنیادی اور فنی باتوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ چونکہ سطور بالا میں ترجمہ کی تعریف بلکہ مختلف تعریفات کو بیان کیا گیا اس لئے درج ذیل سطور میں طریقہ کار، تکنیک، موضوع اور مواد کے اعتبار سے ترجمہ کی قسمیں، ترجمہ میں تہذیبی و لسانی مسائل، ترجمہ کی خصوصیات، مترجم کی خصوصیات، مترجم کے بنیادی فرائض، ترجمہ کے موضوعاتی تقاضے وغیرہ امور سے متعلق اہم باتیں پیش کی جائیں گی۔

تقسیمِ ترجمہ بہ لحاظِ طریقہ کار:

ترجمہ کے عمل میں جو طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے اس کی تقسیم تین طریقوں سے کی جاتی ہے۔(1) لفظی ترجمہ (2)آزاد ترجمہ (3) تخلیقی ترجمہ۔

1) لفظی ترجمہ: اس ترجمہ میں مترجم متن کا پابند ہوتا ہے اس لئے وہ لفظ بہ لفظ ترجمہ کرتا ہے اور متن سے انحراف نہیں کرتا۔ عام طور پر مذہبی اور قانونی تراجم میں اسی طرح کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔

2) آزاد ترجمہ: لفظ "آزاد" سے ہی سمجھ میں آتا ہے کہ مترجم ترجمہ میں آزاد رویہ اختیار کرتا ہے۔ زبان و بیان کے معاملہ میں مترجم کو آزادی ہوتی ہے۔ اس میں مترجم جو مطلب یا منشاء و مفہوم ہوتا ہے اسے سمجھ کر اپنے اسلوب اور الفاظ میں بیان کر دیتا ہے۔ اس میں خصوصاً مطلب پر نظر رکھی جاتی ہے نہ کہ الفاظ و اسلوب اور انداز و آہنگ پر۔

3) تخلیقی ترجمہ: اس نوعیت کے ترجمہ میں مترجم تخلیقیت کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ یہ بامحاورہ ہوتا ہے۔ اسی لئے مترجم خاص طور پر دونوں زبانوں کی تہذیبی و لسانی خصوصیات پر نظر رکھتے ہوئے اور اپنی ادیبانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ترجمہ کرتا ہے اور اصل زبان میں جو لفظیات و تغیرات اور محاورات و ضرب الامثال وغیرہ مستعمل ہیں ہدفی زبان میں اس کی اپنی اس طرح کی خصوصیات کے پیش نظر اس نوعیت کا ترجمہ کرتا ہے۔ اس نوعیت کے ترجمہ میں مترجم کو ذہنی و تخلیقی اعتبار سے کافی ریاض کرنا ہوتا ہے۔

تقسیم ترجمہ بہ لحاظِ موضوع:

یہ واضح بات ہے کہ موضوعات میں تنوع ہوتا ہے اس لئے مختلف موضوعات کے اعتبار سے بھی ترجمہ کی تین قسمیں قرار پاتی ہیں۔(1) ادبی ترجمہ (2) علمی ترجمہ (3) صحافتی ترجمہ۔

1) ادبی ترجمہ: اس میں ادبی لحاظ سے زبان و بیان، روزمرہ، ضرب الامثال، تشبیہات، استعارات اور رموز و کنایات اور علائم کو دیکھا جاتا ہے۔ یہ چوں کہ ادبی ترجمہ ہوتا ہے اس لئے مترجم کو اپنے علم، فہم اور تخیل کو اس میں بروئے کار لانا پڑتا ہے ۔اس میں تخلیقی زبان کے محاسن اور دیگر سیاق و سباق پر گہری نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے اس کے ساتھ ساتھ خیالات کی ترسیل کو بھی ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ غرض یہ تمام وہ عناصر ہیں جو ترجمہ میں ادبیت اور تخلیقیت کا اضافہ کرتے ہیں۔ادبی ترجمہ کے بارے میں سعید روشن یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

> " ہر ترجمہ بامحاورہ ہونا چاہئے اور اپنی زبان کی روزمرہ، تشبیہات، ضرب الامثال، استعارات ، کنایات اور رموز و علامات سے کام لیا جاتا ہے، تاکہ ترجمہ میں ادبی رنگ نمایاں رہے"۔[۳]

یہ تمام وہ خصوصیات ہیں جو ادبی ترجمہ میں ملحوظ رکھی جاتی ہیں۔

2) علمی ترجمہ: اس نوعیت کے تراجم سائنسی علوم، فکر و فلسفہ، ٹکنالوجی و دیگر علوم و فنون پر مشتمل مضامین میں ہوتے ہیں ۔اس میں خاص طور پر اصطلاحات، وضع اصطلاحات اور مترادفات کے مسائل درپیش ہوتے ہیں جو نہایت علمیت اور ماہرانہ صلاحیت کا تقاضہ کرتے ہیں۔

3) صحافتی ترجمہ: اس کو آزاد ترجمہ یا کھلا ترجمہ بھی کہا جاتا ہے۔اس لئے کہ مترجم اس میں اصل مطلب اور مفہوم یا منشا کا پابند ہوتا ہے نہ کہ الفاظ کا۔ چوں کہ یہ صحافتی ترجمہ ہے اس لئے مترجم کو عصری آلات، حالات، واقعات اور جغرافیہ و تاریخ کا علم ہونا ناگزیر ہوتا ہے اور مختلف علاقہ جات اور مقامات کے ناموں و دیگر حالات سے واقفیت بھی ضروری ہوتی ہے جن کی ضرورت تاریخ میں ہوتی ہے۔ چوں کہ صحافت میں عصری حالات و مسائل کا دخل ہوتا ہے اس لئے نئے نئے الفاظ، پیشہ وارانہ اصطلاحات اور جدید ترین ایجادات وغیرہ کی بنا پر تراجم میں اس نوعیت کے تراجم اہم اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔

ترجمہ نگاری کے اغراض و مقاصد:

ترجمہ نگاری کی اہمیت و افادیت مسلمہ ہو گئی ہے اس لئے اس کی نزاکتیں بھی موجودہ زمانہ میں بڑھ گئی ہیں لیکن ترجمہ کس غرض سے کیا جاتا ہے؟ اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ اس کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ علم یا معلومات کا پھیلاؤ ہوتا ہے اور معلومات کے دائرہ میں وسعت و عمومیت کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ چوں کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں مواد کو منتقل کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ سے زبان، تاریخ، تہذیب، ثقافت، جغرافیہ، مطلب یا منشاء وغیرہ ساری چیزوں کو دوسری زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے اس طرح دوسری زبان میں منتقلی سے معلومات یا علم کے دائرہ میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور ایک بڑا مقصد حاصل ہوتا ہے اس سلسلہ میں ڈاکٹر سید محمود کاظمی یوں رقم طراز ہیں:

> "اس بڑے مقصد کی تین نوعیتیں یا تین سطحیں ہو سکتی ہیں۔ معلوماتی، تہذیبی اور جمالیاتی۔ مترجم یا تو محض کسی علم یا فن سے متعلق معلومات ترجمہ کے ذریعہ سامنے لاتا ہے یا تخلیق کی زبان کے تہذیبی پہلو یا خود تخلیق میں موجود تہذیبی تصورات کو ترجمے میں یا ترجمے کی زبان میں منتقل کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے اس جمالیاتی کیف و انبساط کو تخلیق کی زبان سے ترجمہ کی زبان میں کرنا ہوتا ہے جو الفاظ و خیالات کی مخصوص ترتیب و تنظیم سے پیدا ہوتا ہے۔ ترجمے کی یہ نوعیت شاعری کے ترجمے سے متعلق ہے۔ چونکہ یہ عمل سب سے زیادہ مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہے اس لئے بعض مشاہیر نے شاعری کے ترجمہ کو ناممکن قرار دیا ہے"۔[۴]

چوں کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے دوسروں کے بارے میں واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے اس لئے دوسری زبان میں موجود مواد اور دیگر امور جیسے تہذیب و ثقافت اور تاریخ و دیگر حالات سے آگاہی کے پیش نظر ترجمہ سے مدد لیتا ہے اس طرح اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور معلومات میں وسعت پیدا ہوتی ہے جو ترجمہ کا سب سے بڑا فائدہ اور مقصد ہے۔ آج دنیا میں علوم و فنون کا جس قدر پھیلاؤ ہے یا تہذیب و ثقافت و دیگر حالات میں بڑی تیزی سے تبدیلی آرہی ہے تو اس میں حقیقت ترجمہ ہی کا اہم دخل اور عمل ہے۔ اگر یہ معلومات کے دائرہ کی وسعت ترجمہ سے نہ ہوتی تو علوم و فنون انحطاط پذیر ہو جاتے اور ان کا دائرہ محدود ہو کر سکڑ کر رہ جاتا جس کے نتیجہ میں آج کی جو حیرت انگیز ترقی ہو رہی ہے وہ یقینی طور پر رُک جاتی تھی اور انسان کے ہر میدان میں آگے بڑھنے کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوتا۔

ترجمہ میں تہذیبی ولسانی مسائل:

یہ حقیقت ہے کہ زبان اور تہذیب میں ایک خصوصی تعلق ہوتا ہے۔ زبان صرف زبان ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ پوری تہذیب وابستہ ہوتی ہے اس لئے زبان فہمی کے ساتھ ساتھ تہذیب فہمی بھی ضروری ہوتی ہے۔ اس طرح مترجم کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کہ وہ ترجمہ کے عمل میں زبان کی نزاکتوں کے ساتھ ساتھ تہذیب کی نزاکتوں پر بھی بھر پور نظر رکھے۔ ایک زبان کی تہذیب کے تصورات کو دوسری تہذیب کے پیکر میں نہ صرف ڈھالے بلکہ پوری تہذیبی معنویت کو مترجم کو منتقل کرنا پڑتا ہے۔ پروفیسر محمد حسن نے اس سلسلہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یوں لکھا ہے:

> "تہذیب اقدار کو جنم دیتی ہے اور اقدار سے بنتی اور سنورتی ہے اور انہیں کے بل بوتے پر پوری لسانی آبادی کا ردعمل متعین ہوتا ہے۔ ممکن ہے ایک تہذیب میں ایک مخصوص لفظ تصورات کا آئینہ خانہ ہو لیکن وہی تصور جب دوسری زبان کے لفظ میں ادا ہو تو دوسرے تہذیبی سیاق میں مہمل یا بے معنی ہو جائے۔ اس طرح ترجمہ تصورات کی تہذیبی آباد کاری ہے ULTURAEREHABILATION اس ضمن میں خاص طور پر ناول اور افسانوں کے ترجمے آتے ہیں۔ شاعری کے برخلاف ناول اور افسانہ اشیاء اور ماحول کے بیان سے بے تعلق نہیں ہو سکتے اور اشیاء اور ماحول پر تہذیب کی مہر بہت نمایاں ہوتی ہے"۔ ۵

غرض مترجم کو اصل متن کے تہذیبی تصوات کی ترجمے میں باز آبادکاری کرنی پڑتی ہے اس لئے اسے اصل زبان کے تہذیبی عناصر اور تہذیبی تصورات سے واقفیت ضروری ہوتی ہے۔

زبان پر مہارت:

ترجمہ کرنے والے کو دونوں زبانوں پر عبور ہونا ناگزیر ہوتا ہے ورنہ وہ کماحقہ، اس کا حق ادا کرنے سے قاصر ہوتا ہے یعنی غیر شعوری طور پر غلطی ممکن بلکہ عین ممکن ہو جاتی ہے۔ مترجم کو صرف مطلب، مفہوم یا منشاء کی ادائیگی ہی کافی نہیں ہوتی بلکہ اُسے اُس تاثر کو بھی منتقل کرنا ہوتا ہے جو اصل زبان میں موجود ہے اس لئے کہ غم کا تاثر الگ ہوتا ہے۔ الم انگیز لمحات کی باتیں الگ ہوتی ہیں اور نشاط انگیز یا مسرت آمیز باتوں کی کیفیت الگ ہوتی ہے اور یہ تخلیقی صفت ہے جس کو ہدفی زبان میں منتقل کرنا آسان کام نہیں ہوتا ہے۔ یہ امر زبان پر غیر معمولی عبور و دسترس اور مشق و ریاضت کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض علماء لسانیات نے کہا ہے کہ اصل زبان سے زیادہ ہدفی زبان سے واقفیت مترجم کے لئے ضروری

ہوتی ہے یقیناً یہ بات بجائے خود بجا ہے مگر دونوں زبانوں پر دسترس والا مترجم جیسا حق ادا کر سکتا ہے وہ بات الگ ہوتی ہے جو " شرابِ دو آشتہ " کا لطف دیتی ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

قواعد سے واقفیت:

ہر زبان کے اپنے الگ اور مخصوص قواعد یا اصول ہوتے ہیں اور جملوں کی ترتیب یا ساخت کا ایک مخصوص انداز و آہنگ ہوتا ہے۔ مترجم کو ترجمہ کے عمل کے دوران جملوں کی ترتیب یا ساخت پر گہری نظر رکھنی پڑتی ہے تبھی ترجمہ صحیح ہو سکے گا ورنہ نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ بات قواعد کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ جملہ میں فعل، فاعل، مفعول اور اسم و حروف وغیرہ ہوتے ہیں مگر تقریباً ہر زبان میں ان کی ترتیب یا ساخت میں فرق پایا جاتا ہے۔ کبھی فاعل پہلے اور مفعول بعد میں ہوتا ہے اور فعل الگ الگ استعمال ہوتا ہے۔ مترجم کو فعل، فاعل و دیگر متعلقات فعل کے لحاظ سے ترجمہ کرنا پڑتا ہے اور جو معیاری و فصیح ترجمہ ہے وہ کرنا ہوگا۔

محاورات اور ضرب الامثال کے تراجم کی نزاکتیں:

محاورات اور ضرب لامثال ہر زبان میں ہوتے ہیں جو تاریخی، سماجی، سیاسی، مذہبی اور تہذیبی و ثقافتی اعتبار سے اہم اور گراں قدر تجربوں کے امین ہوتے ہیں اس لئے ترجمہ کرتے وقت مترجم کو محاورات اور ضرب الامثال کے لفظی، لغوی، مجازی و مرادی معنی سے واقفیت اور تہذیبی و تاریخی پس منظر پر نظر ہونی چاہئے۔ اگر ہدفی زبان میں متبادل محاورہ یا ضرب المثل نہ ہو تو مترجم کو صرف مطلب کی ادائیگی پر اکتفاء کرنا چاہئے ورنہ لفظی ترجمہ بسا اوقات نہ صرف غیر درست بلکہ مضحکہ خیز بھی ثابت ہوتا ہے اس لئے کبھی ضرب المثل یا محاورہ کی تشریح و تفصیل بھی بیان کرنی پڑتی ہے اگر مناسب یا متبادل محاورہ دستیاب نہ ہو پھر اس میں تہذیبوں کا بھی دخل ہوتا ہے۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی اس سلسلے میں یوں لکھتے ہیں:

> "ہر انسان کی اپنی تہذیب ہوتی ہے۔ مشرقی زبانوں خاص کر اردو میں حفظِ مراتب کا خیال رکھا جاتا ہے۔ جیسے مخاطب کے لئے آپ، تم اور تُو استعمال ہوتے ہیں جو مراتب کو ظاہر کرتے ہیں۔ انگریزی میں ان تمام کے لئے صرف You استعمال ہوتا ہے۔ قدیم انگریزی میں Thou بھی استعمال ہوتا تھا لیکن اب اسے کم ہی برتا جاتا ہے۔ آدابِ نشست و برخاست کا بھی اردو میں بہتر خیال رکھا

جاتا ہے جیسے آیئے، تشریف لایئے، قدم رنجہ فرمایئے وغیرہ جب کہ انگریزی میں Please Come کہنا کافی ہے"۔[۶]

ڈاکٹر ظ۔انصاری نے بھی اس کی ایک اہم مثال یوں دی ہے:

" ایک معمولی کسان اجنبی شکاری کو اپنا مہمان بناتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ "تشریف لے چلئے، نانِ شبینہ تناول فرمالیجئے" تو یہ اصل عبارت Come in and have your dinner کا صحیح ترجمہ ہوتے ہوئے بھی غلط ہے کیوں کہ ایک زبان کے اندر کئی زبانیں ہیں۔ دیکھنا ہوگا کہ "ڈنر" کا لفظ ایک معمولی کسان کی زبان سے ادا ہوگا؟ تو اردو میں کیا ہوگا اور کسی پڑھے لکھے جاگیر دار کی زبان سے ادا ہو تو کیا ہوگا۔ رات کے کھانے کی طرف کسی کو متوجہ کرنے کے لئے کئی قسم کے جملے موجود ہیں اور یہ کئی قسم کے لوگ الگ الگ بولتے ہیں۔ ہمارے یہاں کے غریب کھیت مزدور کے یہاں رات کا کھانا میز پر نہیں چنا جاتا ہے لیکن برطانیہ کے دیہاتی کاشت کار سے یہ توقع کی جاسکتی ہے اور ہمارے جاگیر دار کھاتے پیتے زمین دار گھرانوں میں دستر خوان چنا جاچکا ہے یا تھال لگ گیا ہے یا ماحضر تیار ہے یا نانِ شبینہ حاضر ہے۔ ایسے جملے ہیں جو مختلف معاشرت کے لوگوں میں علیٰحدہ علیٰحدہ بولے جاتے ہیں۔ ان کی زبانوں کا امتیاز سمجھنا اور انھیں حسبِ موقع ترجمہ میں استعمال کرنا بے حد ضروری ہے ورنہ اصل کا سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا"۔[۷]

غرض اس طرح کے تہذیبی عناصر محاورات اور روزمرہ یا ضرب الامثال میں بھی ہوتے ہیں جن کا ترجمہ کرتے وقت مترجم کو ان کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت پر بھی گہری نظر رکھنی پڑتی ہے اور اگر متبادل فراہم نہ ہو تو مطلب کی ادائیگی واضح طور پر کردے اور ضرورت ہو تو اس کی قدرے تفصیل و تشریح بھی کردے۔ اسی طرح تشبیہات و استعارات کا بھی معاملہ ہوتا ہے جن کی تشکیل میں جغرافیہ، معاشرت، اور تہذیب و تمدن کے عوامل کا دخل ہوتا ہے اس کے لئے بھی مترجم کو ہدفی زبان کے اپنے مناسب اور متبادل الفاظ یا تشبیہات و استعارات کو منتخب کرکے استعمال کرنا ہوتا ہے تاکہ زبان کا مزاج بھی ملحوظ رہے۔

اسم سے واقفیت:

یہ واضح بات ہے کہ مختلف افراد، مقامات، علاقہ جات اور اشیاء کے اپنے مخصوص نام ہوتے ہیں۔ مترجم کو ترجمہ کے عمل کے دوران ایسے ناموں سے بھی واسطہ پڑتا ہے اس لئے وہ نام جوں کا توں لکھیں۔ یہ نام دراصل تلفظ کے اعتبار سے لکھے جانے چاہئیں۔ جو نام ہے تو اُسے بعینہ وہی لکھا جائے گا۔ جیسے مشہور فلسفی کا نام ہے Shakespear تو اس کے اردو میں شیکسپیر ہی نام لکھیں گے نہ کہ شیخ پیر۔ اسی طرح متعدد نام ہیں۔ البتہ خصوصی طور پر کچھ نام ایسے ضرور ہیں جو اصل زبان سے دوسری زبان میں تبدیل ہو گئے ہیں تو ان پر بھی گہری نظر درکار ہوتی ہے۔ جیسے Aristotle کو اردو میں "ارسطو" ہی کہا جائے گا اور اسی طرح لکھا جائے گا۔ اس کے ترجمہ میں بھی اسی طرح لکھا جائے گا اور جیسے انگریزی میں الگزینڈر کو اردو میں سکندر یا اسکندر کہا جاتا ہے تو اس طرح متعدد افراد، اشخاص، اشیاء، مقامات اور علاقہ جات وغیرہ کے ناموں سے مترجم کو گہری واقفیت ضروری ہوتی ہے۔ اسی طرح ان مختلف اشیاء یا افراد کی جنس سے بھی مترجم کو واقفیت ضروری ہوتی ہے ورنہ بعض زبانوں میں مذکر اور مونث کے لئے ایک ہی طرح کے افعال استعمال کئے جاتے ہیں تو وہاں اس کا مسئلہ مشتبہ ہو جاتا ہے۔ اگر مترجم کو جنس سے ناواقفیت ہو۔ اسی طرح الفاظ کے مختلف مترادفات بھی ہوتے ہیں اور یہ صورت حال بہت عام ہے جو تقریباً ہر زبان میں ہوتی ہے اس لئے مترجم ایسے مسائل میں بہت محتاط رہے اور باخبری کا ثبوت دے تاکہ ایسے الفاظ جن کے مختلف معانی مستعمل ہوں وہ خلط ملط نہ ہو جائیں بلکہ موقع و محل اور مناسب و موزوں صورت حال کے اعتبار سے درست معنی میں استعمال ہوں۔

اصطلاح سازی کے مسائل سے واقفیت:

ترجمہ کرتے وقت مترجم کو اصطلاحات کے ترجمہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بات بدیہی ہے کہ ہر علم یا فن کی کچھ مخصوص اصطلاحات ہوتی ہیں جن کا ترجمہ مترجم کو کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ اصطلاح پہلے سے موجود ہو تو کوئی بات نہیں ورنہ خود مترجم کو ہدفی زبان میں اصطلاح وضع کرنی پڑتی ہے۔ یہاں سب سے پہلے اصطلاح کی تعریف پیش کی جاتی ہے تاکہ اس کے مسائل سے اچھی طرح واقفیت ہو سکے۔" اگر کوئی لفظ اپنے اصلی معنی کے سوا کسی بھی علم یا فن کے تعلق سے کسی اور معنی میں استعمال ہوتا ہے تو اسے اصطلاح کہا جاتا ہے"۔

علماء ادب اور علماء لسانیات نے یہ بات لکھی ہے کہ مترجم کے لئے سب سے زیادہ دشوار کن مرحلہ اصطلاح یا اصطلاحات کے تراجم کا ہوتا ہے اس لئے کہ سب سے پہلے اسے اصطلاح کا معنی و مفہوم سمجھنا ہوتا ہے۔ پھر ہدفی زبان میں

اس مخصوص اصطلاح کی دریافت ہوتی ہے۔ اگر مناسب اصطلاح دستیاب نہ ہو تو پھر مترجم کو خود اصطلاح سازی کرنی پڑتی ہے جس میں اختصار، جامعیت، انفرادیت اور عصریت کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ جو اصطلاح وضع کی جارہی ہو وہ مختصر ہو، جامع ہو، منفرد ہو اور روح عصریت لئے ہوئے ہو۔ وہ لفظ یا اصطلاح اجنبی یا غیر مانوس و غریب نہ ہو۔ اگر مرکب لفظ ہو تو پھر اس میں صوتی مناسبت ضروری ہوتی ہے تاکہ اس میں آسانی ہو اور زیادہ رواج پانے کی صلاحیت ہو۔ ویسے اصطلاحوں کو تین زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ۱) مفرد اصطلاحات ۲) مشتق اصطلاحات ۳) مرکب اصطلاحات۔

پھر ماہرین زبان نے ان میں سے ہر ایک کی الگ الگ چند شرائط بیان کی ہیں جن میں بنیادی طور پر تسہیل، عام فہم اور جامعیت و مانعیت وغیرہ کی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ پروفیسر وحید الدین سلیم نے خاص طور پر اس موضوع پر " وضع اصطلاحات" کے نام سے اہم کتاب لکھی ہے اور اپنے مضمون" اصول وضع اصطلاحات" میں بھی انہوں نے خاص طور پر بارہ اہم نکات وضع اصطلاحات کے اصول سے متعلق ذکر کئے ہیں۔ اصطلاح سازی کی اہمیت و ضرورت اور اس کے مسائل و امکانات کے بارے میں پروفیسر آل احمد سرور نے یوں لکھا ہے:

> "اصطلاح سازی بہر حال ضروری ہے۔ نئے خیالات کے لئے نئے الفاظ لینے ہوں گے۔ ہاں حالی کے بنائے ہوئے اصول کے مطابق اس معاملہ میں احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ نئے الفاظ نئے ذہن کی تشکیل کرتے ہیں۔ اردو کو جدید ذہن سے ہم آہنگ کرنے کے لئے جدید اصطلاحیں بنائے بغیر چارہ نہیں مگر کوئی جدید چیز بالکل جدید نہیں ہوتی۔ یہ کسی پرانی اور بھولی بسری روایت کی تجدید، توسیع یا ترمیم ہوتی ہے۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے سارے خزانے کو کھنگالیں۔ پیشہ وروں کی اصطلاحات سے مدد لیں اور نئی چیزوں، نئے خیالات، نئے لفظوں کو حسب ضرورت اختیار کرلیں۔ یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ یہ کتابیں کون پڑھے گا۔ طالب علم تو نہ اردو جانتے ہیں اور نہ ہندی نہ انگریزی۔ ایک طرف ہمیں اس پر اصرار کرنا چاہئے کہ جن کی مادری زبان اردو ہے وہ ثانوی تعلیم اردو کے ذریعہ سے حاصل کریں تاکہ ان کی بنیاد مضبوط ہو۔ دوسری طرف ہمیں ان کو افسانہ و افسوں اور جذبات کے محشرستان کے بجائے فکر و نظر کی رفعتوں کی طرف مائل کرنا ہوگا تاکہ وہ جدید ذہن پیدا کرسکیں اور جدید ذہن کی مدد سے موجودہ دور کی پُر پیچ اور نت نئے روپ

بدلنے والی زندگی کے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ تراجم اور تصانیف کے کام میں یہی آدرش ہونا چاہئے"۔ ۸؎

اصطلاحات کے بعض نمونے ملاحظہ ہوں:

زبردستی کا پمپ	:	Force Pump
کلاں بیں	:	Microscope
منعکس دوربین	:	Reflecting Telescope
انتظامیہ	:	Administration
استعارہ	:	Metaphor
حلف نامہ	:	Affidavit
آدم خور	:	Cannibal

چوں کہ اصطلاح سازی کی زیادہ ضرورت سائنسی اور دوسرے کار آمد مغربی علوم میں خاص طور پر ہوتی ہے اسی لئے اس کی نزاکت و اہمیت کے پیش نظر تقریباً دو سو سال پہلے ہی سائنسی کتابوں کا کام شروع ہو چکا تھا۔ اس سلسلہ میں محققین نے خاصی کوششیں کی ہیں۔ حیدر آباد دکن اس طرح کے تراجم کا ابتداء ہی سے اہم مرکز رہا ہے جہاں 1834ء میں امیر و کبیر نواب فخر الدین خاں شمس لامراء نے ایک دار الترجمہ بھی قائم کیا تھا۔ اس دار الترجمہ سے کئی سائنسی علوم کی کتابیں ترجمہ کی گئیں جن میں ستہ شمسیہ، کیمسٹری کا مختصر رسالہ، رسالہ مفتاح الافلاک، رسالہ مختصر حیوانیات مطلق اور منتخب البصر وغیرہ شائع ہوئیں۔ اس مرکز میں کئی اصطلاحیں وضع کی گئیں۔ اس میں شاہان اودھ (لکھنو) نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سید کمال الدین حیدر نے مغربی علوم کے 19 رسالوں کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا جن میں رسالہ ہیئت، رسالہ علم الہوا اور رسالہ علم الحرارت وغیرہ شامل ہیں۔ دہلی کالج کے مترجمین نے بھی تقریباً علوم کی تیس (30) کتابوں کا ترجمہ کیا اور سر سید احمد خاں کی سائنٹفک سوسائٹی (1863) نے بھی تراجم اور اصطلاح سازی کے باب میں اہم خدمات انجام دیں اور جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے دار الترجمہ نے بھی نمایاں خدمات انجام دیں اور وضع اصطلاحات کے سلسلہ میں پروفیسر وحید الدین سلیم نے اصول وضع کئے تاکہ اصطلاح سازی کی جائے اور اردو ادب کے دامن کو مالا مال کیا جا سکے۔ ڈاکٹر محمد جنید ذاکر نے "اصطلاحی مطالعے" کے نام سے باضابطہ ایک تحقیقی ضخیم کتاب شائع کی جس میں انہوں نے

وضع اصطلاحات سے متعلق خدمات کا از اول تا عہدِ حاضر بھرپور ذکر کیا اور ادبی، تاریخی، بشری، سماجی، جغرافیائی، سیاسی، فلسفی، معاشی، نفسیاتی اور نظم و نسق عامہ وغیرہ کا تفصیلی و تحقیقی تقابلی مطالعہ و جائزہ پیش کیا ہے جو اپنے موضوع کا زبردست جامع انداز سے احاطہ کرتی ہے۔ اس میں وہ" اردو میں وضع اصطلاحات کی تاریخ ابتداء سے 1917ء تک، ایک جائزہ" میں یوں لکھتے ہیں:

"یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ اصطلاحات سازی کی ضرورت دراصل ہندوستان میں مغربی علوم کی اشاعت کے دوران محسوس کی گئی۔ اس سے قبل جتنے بھی ترجمے ہوئے وہ زیادہ تر سنسکرت، عربی، فارسی وغیرہ سے کئے گئے چوں کہ اردو زبان کا کینڈا اور اردو زبان کا خمیر خود ان زبانوں کے الفاظ سے تیار ہوا تھا اور ان زبانوں کے الفاظ کے انجذاب سے اردو کا آمیزہ تیار ہوا تھا۔ اردو زبان میں فارسی، عربی و سنسکرت کے بے شمار الفاظ حلول کر چکے ہیں اور اردو زبان کا جزو لا ینفک بن چکے تھے۔ اردو میں بے دریغ اور بلا جھجک ان زبانوں کے الفاظ کو برتا جاتا تھا اور اظہار کے لئے ان زبانوں کے مخصوص و مشکل الفاظ جن کا اردو میں کوئی متبادل لفظ نہیں ملتا انہیں جوں کا توں استعمال کیا جاتا تھا۔ اس لئے وضع اصطلاحات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا بلکہ ان زبانوں کی مدد سے مغربی زبانوں سے اردو زبان میں علمی اصطلاحیں وضع کی گئیں۔ اصطلاح سازی کا کام مغربی اقوام بالخصوص انگریزوں کی آمد اور جدید مغربی علوم سے ہندوستانیوں کی آگاہی کے دوران عمل میں آیا"۔[9]

غرض ترجمہ کے دوران پیش آنے والے مسائل میں "اصطلاح سازی" ایک اہم مسئلہ ہے جس کی دشواریوں اور مختلف مسائل پر سطور بالا میں قدرے تفصیل سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس پہلو پر بھی مترجم کو نظر رکھنی پڑتی ہے۔

اصل یا متن کی زبان:

۔ مفرد الفاظ، اصطلاحات، محاورے

۔ الفاظ کی نشست و برخاست۔ صرف و نحو

۔ الفاظ کے لفظی و معنوی رشتوں کا شعور۔ صنائع لفظی و معنوی

۔الفاظ، تراکیب اور ان کی لغوی دلالت

۔زبان کا کینڈا اس کی اصل روح

۔عبارت یا متن کی ظاہری وضع اور مفہوم

۔اسلوبیاتی نظام

۔اصل متن کی روح، نوعیت، جذبات، محاکات اور اس کا آہنگ (باطنی سطح پر)

۔مصنف کا ذوق اور لب و لہجہ

۔اس زبان سے مخصوص جوہر خفیہ اور جاگی ہوئی صلاحیتیں، کوتاہیاں، زندہ روایت کا شعور اور ارتقائی خواص۔

۔جملوں کی ساخت

۔ترجمہ کے لئے اصل متن کی جزوی یا کُلّی موزونیت یا ناموزونیت

۔اساطیری نظام اور روایت

۔وزن اضافی کا خیال رکھنا یعنی عریاں، برہنہ اور ننگا جیسے الفاظ میں نازک امتیازات کا خیال رکھنا

مترجم کی زبان:

۔قاری کی شعوری سطح، ادراک، مزاج اور لہجہ

۔اپنے معاشرہ کی وضع اور خُوبُو

۔اپنے تہذیبی و تمدنی لوازمات

۔مترادفات

۔صرف و نحو

۔اپنی زبان کا کینڈا، وضع، روایات اور صلاحیتیں

مترجم کی ذات:

۔ترجمہ کا ذوق

۔اصل متن اور مصنف سے وفاداری، اس کی نقالی یا بنت کی سطح پر مزید جِلا دینا

۔اصل متن کی مخصوص وضع کو منتقل کرنے کا جتن

۔اصل متن، مصنف یا غیر تہذیب کا باغی نہ ہونا

۔اصل سے مرعوب نہیں بلکہ اصل مصنف اور متن کا مُطیع ہونا۔

ترجمہ کی نوع:

۔ قابل مطالعہ ہونا

۔مانوس ہونا

۔رواں اور صاف ہونا

۔ترجمہ پن کا نہ ہونا۔[۱۰]

مترجم کی خصوصیات:

ترجمہ کا سارا دارومدار مترجم پر ہوتا ہے۔اس لئے مترجم میں بھی خصوصیات مطلوب ہوتی ہیں جن کی بناء پر اُسے ایک کامیاب مترجم قرار دیا جاسکتا ہے۔یوں تو مترجم کی خصوصیات کے بارے میں ماہرین نے اپنے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے تاہم آفتاب عالم بیگ نے اپنے مقالہ "ترجمہ کے لئے دونوں زبانوں میں مہارت" میں شاہ پرتگال کنگ ڈیوراٹ کے حوالہ سے مترجم کی چند خصوصیات ذکر کیں ہیں جو درج ذیل ہیں۔

۔مترجم اصل متن کے معانی کو سمجھنے اور ترجمہ میں انہیں کسی تبدیلی کے بغیر بہ تمام و کمال منتقل کرنا۔

۔مترجم، ترجمے میں ترجمہ کی زبان کا روزمرہ اور محاورہ استعمال کرے۔اصل متن کی زبان سے مستعار نہ لے۔

۔مترجم ترجمہ کی زبان میں ایسے الفاظ استعمال کرے جو اصل زبان کے الفاظ کے راست اور مناسب متبادل ہوں۔

۔مترجم درشت اور ناپسندیدہ الفاظ سے گریز کرے۔

۔مترجم ان تمام اصولوں کی پابندی کرے جو عبارت نگاری کا لازمہ ہیں یعنی اس کی تحریر واضح، قابل فہم اور مفید ہو۔اسی طرح Etienne Dolet (1509-1546) اپنی کتاب "The best way translationg from one language to another" میں لکھتے ہیں کہ مترجم کو چاہئے کہ۔۔

۔اصل معنی کو سمجھے

۔اصل زبان اور ترجمہ کی زبان پر عبور رکھے

۔لفظی ترجمہ سے گریز کرے

۔ترجمہ میں بامحاورہ زبان استعمال کرے

۔الفاظ کے انتخاب اور ترتیب میں احتیاط برتتے ہوئے جملوں میں مناسب آہنگ پیدا کرے۔[11]

☆☆☆

حوالہ جات

۱) ماہنامہ قومی زبان۔ صفحہ نمبر ۴۴ (اردو اکیڈمی تلنگانہ) جون ۲۰۱۲ ۔حیدرآباد، دکن۔

۲) ترجمہ کا فن اور روایت۔ مرتبہ، پروفیسر قمر رئیس۔ صفحہ نمبر ۱۵۱۔۱۵۲ ۔

۳)ماہنامہ شاعر۔ صفحہ نمبر ۴۰ ۔ ممبئی اگست، ۲۰۱۴ ۔ ممبئی۔

۴)ترجمہ کا تعارف (نصابی کتاب) صفحہ نمبر ۱۰ ۔مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔ دکن۔ ۲۰۰۷ ۔

۵) ترجمہ کا فن اور روایت۔ مرتبہ، پروفیسر قمر رئیس۔ صفحہ نمبر ۶۲۔۲۳ ۔

۶) اردو ادب و ترجمہ نگاری (نصابی کتاب) صفحہ نمبر ۲۳۔ڈاکٹر بی آر امبیڈکر یونیورسٹی حیدرآباد، دکن۔ ۲۰۰۸ ۔

۷) ترجمہ کا فن اور روایت۔ مرتبہ، پروفیسر قمر رئیس۔ صفحہ نمبر ۷۹ ۔

۸)ترجمہ کا فن اور روایت۔ مرتبہ، پروفیسر قمر رئیس۔ صفحہ نمبر ۵۹ ۔

۹) اصطلاحی مطالعے۔ڈاکٹر محمد جنید ذاکر۔ صفحہ نمبر ۳۳۔۳۴۔ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی۔ ۲۰۱۵۔

۱۰) فن ترجمہ نگاری۔ خلیق انجم۔ صفحہ نمبر ۳۳۔۳۴۔۳۵ ۔ ثمر آفسٹ، دہلی۔۱۹۹۶۔

۱۱) ترجمہ کا تعارف۔ صفحہ نمبر ۸۲ ۔۸۳ ۔مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔ دکن۔ ۲۰۰۷ ۔

☆☆☆

باب دوّم

ترجمہ بحیثیت شعبۂ علم

ترجمہ بحیثیت شعبۂ علم

اس میں شک نہیں کہ ترجمہ اب ایک باضابطہ علم کا شعبہ بن چکا ہے۔ چوں کہ یہ ایک بین شعبہ جاتی علم کا میدان ہے اس لئے اس کی عمومیت کا اعتبار کرتے ہوئے اس کو مطالعاتِ ترجمہ کہا جارہا ہے۔ اس میں ترجمہ، ترجمہ کے نظریات ،توضیحات، اصول و قواعد اور اطلاقات کا خصوصی طور پر مطالعہ کیا جاتا ہے۔

یہ بات یقیناً درست ہے کہ خصوصی طور پر اردو میں ترجمہ کے سلسلہ میں زیادہ ٹھوس کام انجام نہیں دئے گئے اور ابھی ترجمہ کے سارے نظریات اور اصول و قواعد کے سلسلہ میں مباحث کی کافی گنجائش موجود ہے اور اس علم ترجمہ کے متعلق توضیحات کے دروازے کھلے ہوئے ہیں جن پر تحقیق کی جاسکتی ہے تاہم یہ شعبۂ ابھی ابھر رہا ہے۔ جامعات میں بھی اس طرف پوری توجہ نہیں دی گئی اور چند ہی جامعات میں یہ شعبہ ملتا ہے۔ ترجمہ سے متعلق ساری بحثیں مطالعاتِ ترجمہ کے جامع لفظ میں آجاتی ہیں جس کو علم ترجمہ کہا گیا ہے۔

بنیادی طور پر اس علم کے دو پہلو نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک پہلو وہ ہے جو ترجمہ کے نظریات و افکار سے متعلق ہے اور دوسرا اطلاقی پہلو ہے۔ اس تقسیم کو تجریدی اور اطلاقی بھی کہا جاتا ہے۔ تجریدی پہلو میں ترجمہ کے افکار و نظریات اور اصول و ضوابط شامل ہیں۔ جب کہ دوسرے پہلو میں ترجمہ کے انھیں نظریات کے اطلاقات سے بحث ہوتی ہے۔

نظریہ دراصل کسی موضوع سے متعلق کافی غور و فکر کرنے کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ عمومی طور پر نظریہ میں آفاقی حقائق ہوتے ہیں اور اصول و ضوابط ہوتے ہیں۔ Holmes نے نظریہ کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا ہے یعنی عمومی اور جزوی۔

مطالعاتِ ترجمہ کے عمومی نظریات:

مطالعاتِ ترجمہ کی یہ وہ شاخ ہے جس میں ترجمہ کے عمومی اصول اور آفاقی نظریات سے بحث ہوتی ہے اور ترجمہ کے نظریات کا اطلاق ہوتا ہے چاہے کسی بھی موضوع سے متعلق ہو۔ جیسے یہ نظریہ و اصول کہ ترجمہ میں دیانت داری اور غیر جانب داری چاہئے یا یہ کہ مترجم کے لئے اصل اور ہدفی دونوں زبانوں پر دسترس ہونی چاہئے یہ سب بنیادی اصول ہیں جن کا اطلاق ہر جگہ ہوتا ہے۔ یہ ترجمہ کے عمومی نظریات کی بات ہے۔

ترجمہ کے جزوی نظریات بھی ہوتے ہیں جن کا اطلاق عمومی نہیں ہوتا ہے بلکہ خصوصی ہوتا ہے۔ اس جزوی قسم کی دیگر شاخیں بھی ہو سکتی ہیں۔ جیسے :

1) انسانی تراجم

2) مشینی تراجم

3) مشین اعانتی انسانی تراجم

4) انسانی اعانتی مشینی تراجم

علاوہ ازیں ترجمہ کے نظریات، علاقہ، معیار، متن، زمانہ اور مخصوص مسائل کی بنیاد پر بھی متعین ہوتے ہیں ان کے علاوہ کے بھی امکانات ہو سکتے ہیں ویسے نظریہ سازی کے معاملہ میں ابھی کافی گنجائش موجود ہے۔

مطالعات ترجمہ کا دوسرا پہلو اطلاقی پہلو ہوتا ہے جس میں مترجم کی تربیت اور ترجمہ کے دیگر اسباب و عوامل شامل ہیں۔ یہ پہلو بنیادی طور پر عملی ہوتا ہے اس میں ترجمہ کی تنقید بھی شامل ہے۔ اس طرح ترجمہ بہ حیثیت شعبہ علم نہایت کار گر اور ممد و معاون ثابت ہو رہا ہے۔

ترجمہ کی نوعیت:

ترجمہ میں یہ بات نہایت اہمیت کی حامل ہوتی ہے کہ مترجم اس بات پر نظر رکھے کہ وہ کس کے لئے ترجمہ کر رہا ہے یعنی اس کا قاری کون ہے اور اس کی زبان، تہذیب اور تاریخ و تمدن کی کیا حالت ہے؟ اس لئے کہ دونوں زبانوں کی تہذیب الگ ہوتی ہے اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لفظ تو ایک ہی ہوتا ہے مگر سیاق و سباق کے اعتبار سے اس کا مفہوم بدل جاتا ہے یا اسی طرح لفظ تو ایک ہوتا ہے مگر مختلف علوم کی اصطلاحات کے اعتبار سے اس کے معنی و مفہوم میں فرق ہوتا ہے جیسے

مثال کے طور پر لفظ موضوع ہے۔ علم لغت کے اعتبار سے اس کے معنی الگ ہوتے ہیں۔ علم منطق میں اس کا مفہوم الگ ہوتا ہے اسی طرح علم حدیث و علم اسماء الرّجال میں لفظ موضوع کا معنی و مفہوم بالکل الگ ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر مترجم کو ان سارے امور سے واقفیت ناگزیر ہو جاتی ہے تبھی وہ ترجمہ سے انصاف کر سکتا ہے۔ اسی طرح بہت سے محاورات بھی ہوتے ہیں جن کے مفہوم میں فرق کرنا ضروری ہوتا ہے اور ترجمہ کرتے وقت اس آزمائش سے مترجم کو گزرنا پڑتا ہے۔

علوم کے اعتبار سے لفظی ترجمہ بھی ہوتا ہے مگر اس میں بعض ماہرینِ زبان کی صراحت کے مطابق معنی کی منتقلی تو ہو سکتی ہے مگر اصل زبان کی پوری کیفیت، تہذیب، جذبات، رسم و رواج وغیرہ کی منتقلی نہیں ہوتی ہے اور عموماً ایسا ہوتا ہے کہ لفظی ترجمہ میں زبان و بیان کا لطف پیدا نہیں ہوتا ہے اور یہ اکھڑا اکھڑا سا ترجمہ ہوتا ہے اگرچہ کہ اصل زبان کے الفاظ سے قریب تر ہوتا ہے اور مشینی ترجمہ میں لفظی ترجمہ ہی ہوتا ہے اس لئے کہ مشین انسان کے ذہن کی طرح تو کام نہیں کرتی کہ جو سیاق و سباق کو دیکھے اور موقع و محل کی مناسبت سے الگ ترجمہ کرے۔ مشین زبان کی تہذیب سے اور متن یا ماحول کی کیفیت سے واقفیت والی نہیں ہوتی ہے جیسے انسان ہوتا ہے۔ ترجمہ میں لفظ کے برابر لفظ رکھنا نہیں ہوتا ہے بلکہ اس پوری ادبی و تہذیبی فضاء کی منتقلی کا مسئلہ ہوتا ہے۔

یقیناً ترجمہ ایک زبان کے مواد کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا نام ہے۔ ترجمہ کی یہ مختصر سی تعریف ضرور ہے مگر اس ترجمہ کی سرگرمی کے دوران مترجم کو مختلف مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے جس میں لفظ و معنی، مفہوم و منشائ، قواعد ، تہذیب اور مزاج و منہاج وغیرہ کئی امور ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود ترجمہ کی ضرورت ہر دور میں محسوس کی گئی ہے اور آج کے دور میں تو یہ باضابطہ ایک فن بن چکا ہے جس کے اپنے اصول، قواعد اور نظریات نہ صرف متعین ہوتے ہیں بلکہ ان کی باضابطہ تعلیم بھی جامعات میں ہو رہی ہے۔

آج کے مصروف ترین دور میں ہر شعبۂ حیات میں ترجمہ کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے چاہے وہ علم و ادب کے معاملات ہوں یا معاشی و معاشرتی امور ہوں یا تجارتی سرگرمیاں ہوں یا مذہب و مسلک کی ترسیل و تبلیغ کے مرحلے ہوں اور اس کے فوئد بھی برابر آج محسوس کئے جا رہے ہیں۔ خاص طور پر زبانوں کی وجہ سے ترسیل و ابلاغ کے بے شمار مسائل پیدا ہوتے ہیں اور یہ سارے مراحل و مسائل ترجمہ کے ذریعہ حل ہوتے ہیں اس لئے جہاں دیگر ذرائع علوم و فنون کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں وہیں عصرِ حاضر میں ترجمہ نے بھی ایک اہم محرک بن کر ابھرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ آج کے اس دور میں جہاں سائنس اور ٹکنالوجی کے اضافہ اور ترقی نے بہت سی دشوار گزار راہوں کو آسان کر دیا ہے

اور خود ترجمہ کے میدان میں بھی آسانیاں ضرور ہوتی ہیں مگر پھر بھی مترجم کی اہمیت مسلمہ رہی ہے۔ مشینی ترجمہ کی ایجاد نے ترقی کی ایک جَست ضرور لگالی ہے تدریس میں ابھی اس نے مکمل طور پر کامیابی حاصل نہیں کی ہے۔ یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ عالم کاری کی وجہ سے ترجمہ کی اہمیت وضرورت میں حد درجہ اضافہ ہوا ہے۔

"اس میں شک نہیں کہ ترجمہ کے خلاف میں بھی متعدد باتیں کہی گئیں کہ اصل کا ترجمہ کبھی نہیں ہو سکتا اور یہ کہ ترجمہ کرنا دراصل ایک سعئ نامشکور ہے اور خود گرانٹ شاور مین کر سپلی نے تو ترجمہ کرنے کو گناہ قرار دیا ہے"۔[۱]

ان ساری باتوں کے باوجود آج ترجمہ نے بہت سے معرکے سر کئے اور ہر شعبہ میں اپنا لوہا منوایا ہے اور آئے دن اس کی فتوحات کا دائرہ بڑھتا ہی جارہا ہے۔

یقیناً ترجمہ ایک سرگرمی ہے۔ایک عمل ہے جو بے حد ریاض چاہتا ہے خواہ کسی بھی زبان کا معاملہ ہو اگر ترجمہ یا تراجم نہ ہوتے تو علوم وفنون میں اتنی وسعت پیدا نہ ہوتی۔ آج جتنے بڑے بڑے مفکرین اور ماہرین علوم وفنون ہیں جیسے ارسطو، عمر خیام، ٹیگور اور غالب واقبال وغیرہ ان سب کی عظمتِ فن میں تراجم کا غیر معمولی حصہ رہا ہے اور انھیں تراجم کی وجہ سے ان کے صحیح مقام ومرتبہ سے آج دنیا واقف ہوئی ہے اسی طرح تمام علمائے علم وادب ہیں جیسے رازی، غزالی، رومی اور سعدی وجامی وغیرہ یہ تراجم عربی کے بھی ہوئے، فارسی کے بھی ہوئے، انگریزی ودیگر زبانوں کے بھی ہوئے چنانچہ مغلیہ سلطنت میں سنسکرت زبان سے فارسی زبان میں کافی تراجم ہوئے۔اسی طرح انگریزی زبان سے ہندوستان کی مقامی زبانوں میں بھی تراجم ہوئے۔ فورٹ ولیم کالج نے اردو زبان وادب کی ترقی وترویج میں اہم کردار ادا کیا ہے اسی طرح دارالترجمہ حیدرآباد دکن میں بھی باضابطہ ماہرین نے متعدد کتابوں کا اردو ترجمہ کیا۔ علاوہ ازیں دیگر بہت سے امراء اور نوابوں نے تراجم کا بیڑہ اٹھایا جن میں حیدرآباد دکن میں خصوصاً نواب فخر الدین خان شمس الامراء کی کوششیں بھی شامل ہیں۔دہلی کالج کی کوششوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا جہاں تراجم کی باضابطہ پہلی کوشش ملتی ہے۔اس سلسلہ میں انجمن اشاعتِ علوم بذریعہ السنہ ملکی(دہلی) ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام بھی ہوا۔اس انجمن کے اپنے مخصوص اصول اور ضابطے تھے۔ان ساری کوششوں میں بھی سب سے زیادہ ممتاز اور مشہور ومقبول اور کامیاب جامعہ عثمانیہ کے زیر اہتمام قائم شدہ سررشتہ تعلیم وترجمہ کا شعبہ رہا جہاں ترجمہ کی منظم اور باضابطہ کوششیں بے حد کامیاب رہیں اس لئے کہ وہاں یہ کام بامقصد ہوا تھا کہ ان ترجمہ شدہ کتابوں کو نصاب میں داخل کیا جائے یعنی باضابطہ ان کا نفاذ کیا جائے اور ان میں ادب

،آرٹس، سائنس، انجینئرنگ اور طب وغیرہ کتابیں شامل تھیں جو جدید علوم پر مشتمل تھیں۔ اعلیٰ تعلیم کا یہ تجربہ نہایت کامیاب رہا اس لئے کہ وہاں نہ صرف تراجم ہوتے اور اصطلاحات وضع کی جاتیں بلکہ ان پر از سرِ نو غور و فکر کیا جاتا تھا جن میں لسانیات کے عالم اور ماہرین فن شامل تھے۔

سر سید کا پورا مشن ہی ہندوستانیوں میں تعلیم اور علوم و لسانیات کے اعتبار سے شعور بیداری اور انقلاب لانا تھا۔ اس کی اہمیت کو اجاگر کرنا تھا تاکہ مسلمان دوسری قوموں کے ساتھ برابر چلیں۔ چنانچہ ان کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی کے تراجم بھی تراجم کی روایت کو استحکام بخشنے والے ہیں۔ اس سوسائٹی کو باقاعدہ تجاویز، ضابطے اور ماہرینِ فن و لسانیات کی خدمات حاصل تھیں۔ اس کی اپنی پوری ایک تاریخ ہے غرض مولوی عبدالحق کے بقول اس سوسائٹی کے زیر اہتمام تقریباً چالیس کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائی گئیں جبکہ بعض دیگر حضرات نے ان تراجم کی تعداد صرف پندرہ بتائی ہیں۔ ان تراجم کی مدد سے اس زمانہ میں اردو کی صورتِ حال اور زبان و بیان نیز افکار و خیالات سے بھرپور آگاہی ہوتی ہے کہ کس طرح تبدیلیوں کا عمل جاری تھا اور کس طرح یہ مدارج طئے ہوتے گئے۔ اس لئے اردو نثر، شاعری، تعلیم و دیگر علوم کے ساتھ ساتھ تراجم کی دنیا میں بھی سر سید کی خدمات اہمیت کی حامل رہیں۔

ترجمہ یقیناً ایک فن ہے جس کے لئے دونوں زبانوں پر قدرت، ذہانت، سنجیدگی، علم اور مشق و مزاولت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ صفت بہت کم اہل علم میں پائی جاتی ہے۔ ایک زبان کے مواد کو دوسری زبان میں منتقل کرنا نہایت ریاض چاہتا ہے۔ یہ سلسلہ زبان ہی کی طرح قدیم ہے اور یہ ایک اہم ذریعہ ہے جس کی بدولت اپنے خیالات، افکار اور نظریات کو دوسروں تک بہتر طریقے سے پہنچایا جاسکتا ہے اور اسی کے ذریعہ علوم و فنون کا دائرہ بڑھتا ہے۔ ترجمہ ایک فن بھی ہے اور علم و فن کے باب میں ایک اہم اضافہ بھی ہے۔ اسی لئے ہم اگر اس کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہر زمانے میں ترجمہ کی اہمیت و ضرورت کو تسلیم کیا گیا البتہ اس میں جامعات، اداروں، شخصیتوں اور اہل علم نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ چنانچہ اشوک اعظم، پاٹلی پترا، بغداد اور بنو عباس، قاہرہ، اسکندریہ، آگرہ، عہد اکبری اور حیدرآباد میں دارالترجمہ میں یہ کارنامے انجام دئے گئے ہیں جو تراجم سے متعلق ہیں اسی طرح فورٹ ولیم کالج کی خدمات بھی رہیں جن کا اثر زبان اور لسانیات پر پڑا۔

بہت سے علمائے ادب نے تو یہ بھی کہا ہے کہ اردو زبان ہی دراصل ترجمہ کی بدولت وجود میں آئی جو ایک ناقابل تردید حقیقت ہے اس لئے کہ اردو زبان کی تعمیر اور پرورش و پرداخت بلکہ ترقی و فروغ میں عربی، فارسی، ترکی، ہندی

،انگریزی اور دیگر زبانوں کا بڑا دخل رہا ہے۔ پھر اس میں یہ بات بھی نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ ہر زبان کا ایک الگ مزاج ہوتا ہے اور اس کی اپنی الگ تہذیب ہوتی ہے۔الگ استعارے ہوتے ہیں۔الگ تشبیہات ہوتی ہیں۔الگ الگ محاورات ہوتے ہیں، الگ الگ نظریات اور تصورات ہوتے ہیں جن میں علاقہ ،تاریخ، جغرافیہ، سماج، معاش، معیشت و دیگر عوامل اثرانداز ہوتے ہیں۔ جیسے مثال کے طور پر فارسی زبان ہے جس میں آریائی زبان کے خاندان، پہلوی زبان کی تہذیب، کیانی خاندان کی شان و شوکت اور ایران کی آب و ہوا کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ بعد میں اہل عرب کے غلبہ کی بدولت اس میں عربی الفاظ و اصطلاحات ،تاتاری حملوں کے اثرات، انگریزی اور فرانسیسی تہذیب اور بعد ازاں جمہوری تحریک کے اثرات اس میں در آئے مگر جو اثرات حاوی رہے یا اسے راس آئے وہی جاری رہے اور مقبول رہے۔ ان سب کے باوجود فارسی زبان نے انگریزی کے مزاج کو قبول نہ کیا اس لئے ٹ،ڈ اور ڑ کے حروف اس میں راہ نہ پاسکے جبکہ فرانسیسی اور روسی الفاظ اس میں مل جاتے ہیں اس لئے جو فارسی سے اردو میں تراجم کی خدمات انجام دیتے ہوں انھیں اس پوری تاریخ و تہذیب اور اثرات کا علم ہونا چاہئے تاکہ وہ ترجمہ سے انصاف کر سکیں۔

زبانوں کے بارے میں ایک بات یہ بھی بہت اہم ہوتی ہے کہ ایک ایک زبان میں بھی بہت سی زبانیں ہوتی ہیں۔ جیسے ماحول و معاشرہ میں کوئی شخص عام آدمی کی سی حیثیت رکھتا ہے اور کوئی خاص آدمی ہوتا ہے۔ کوئی طنز و مزاح کے وصف سے متصف ہوتا ہے اور کوئی عالم و فاضل یا دانشورانہ مزاج کا مالک ہوتا ہے اور ان سب کی زبان الگ الگ ہوتی ہے اور ہر ایک کی تہذیب و شائستگی اور طرز و اسلوب جداگانہ ہوتا ہے۔ اب یہ مترجم کی صلاحیت کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ کس طرح ان ساری نزاکتوں کو ترجمہ کے ذریعہ واضح کرتا ہے اور کیسے تعبیرات و ترکیبات کو برتتا ہے۔ اسی طرح انسان کے پیشہ اور کام کے اعتبار سے بھی زبان کا انداز اور الفاظ و تشبیہات نیز استعارات و اصطلاحات کا فرق پایا جاتا ہے جو مترجم کے لئے ترجمہ میں اعلیٰ ذہانت اور قابلیت کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ترجمہ میں اور ہدفی زبان میں بھی روانی اور شُستگی آسکے اور وہ پوری تہذیب منتقل ہو سکے۔ جیسے خاص طور پر انجیل کے تراجم میں کلامِ ربانی کی سی شان کو باقی رکھنے کی پوری کوشش ملتی ہے اس سلسلہ میں ڈاکٹر ظ۔انصاری نے ایک بہترین مثال اپنے مضمون "ترجمہ کے بنیادی مسائل" میں یوں پیش کی ہے:

> "ایک شخص جو تشی ہے وہ کسی کا ہاتھ دیکھ رہا ہے اور اپنے معمول کو بتاتا ہے کہ یا تو تم فلاں فلاں پر ایمان لاؤ۔ ورنہ Or less ye forever be condemned اب اگر ایمان کے بجائے انگریزی لفظ "Confidence " کا ترجمہ یقین، بھروسہ یا اعتماد لکھ دیا گیا اور اس کے

بعد والے جملے کا ترجمہ سیدھا سادہ کر دیا گیا کہ "ورنہ تم ہمیشہ مصیبت میں رہو گے" یا "ہمیشہ تم دھتکارے جاؤ گے" تو اصل عبارت کی غرض اور فضا غارت ہو جائے گی کیوں کہ انگریزی کا جملہ خاص انجیل کی عبارت کا حصہ ہے اور اسے ترجمہ یوں ایسے آنا چاہئے جیسے کوئی مقدس بر گزیدہ ہستی ارشاد فرما رہی ہے اور ربّانی احکام پہنچا رہی ہے۔ اس جملہ کا بہتر ترجمہ یہ ہو گا "ورنہ ابد تک معتوب رہو گے"۔ ۲

ایک اور بات تراجم کے سلسلہ میں اہمیت کی حامل ہوتی ہے کہ زبان تو ایک ہی ہوتی ہے مگر اس میں بھی قدیم اور جدید زبان کا اثر ہوتا ہے۔ جیسے بہت سے الفاظ زمانے کے اعتبار سے متروک قرار دئے گئے جب کہ پہلے زمانے میں وہ الفاظ استعمال ہوتے تھے جیسے جگہ، جاگہ۔ تک، تلک وغیرہ۔

جہاں تہذیب، پیشہ، جگہ یا مقام و محل اور مزاج و منہاج کی رعایت، زبان کے تراجم کے سلسلہ میں رکھنی پڑتی ہے اسی طرح مذہب اور اس کے متعلقات کے سلسلہ میں بھی تقدس اور مقام و محل یا شان اور کیفیت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید کے بیسیوں تراجم میں چند ہی تراجم مقبول و مشہور ہیں یا کم پڑھے جاتے ہیں اور بعض ایسے مفسرین کرام گزرے ہیں جنھوں نے ترجمہ میں پیغمبرانہ شان و شوکت کے اعتبار سے درست اور صحیح الفاظ کو استعمال نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود انھیں کے زمانے میں اور بعد میں بھی ان پر تنقیدیں ہوئیں جس کے نتیجہ میں وہ مقبول و عام نہ ہوئے۔

ترجمہ یقیناً ایک آرٹ اور فن ہے۔ اس سرگرمی اور اس عمل میں ترجمہ کرنے والے کا دلی جذبہ ظاہر ہونا بھی ضروری ہوتا ہے تبھی اس میں تخلیقی صفت در آتی ہے۔ جیسے اقبال نے کہا ہے:

نقش ہیں سب ناتمام، خونِ جگر کے بغیر　　نغمہ ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر

اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ اصل اصل ہوتا ہے اور نقل نقل ہوتا ہے مگر نقل میں اصل کا رنگ آجائے، اس کے لئے مترجم کو اپنا جذبہ اُندروں اس میں پیش کرنا پڑتا ہے تبھی اصلیت کے محاسن اس میں ابھرتے ہیں۔ ترجمہ میں اصل کا پورا رنگ، پوری شان، پوری کیفیت، پوری آب و تاب، روانی و شگفتگی، سلاست و طلاقت اور تہذیب و تمدن کی ساری خوبیاں در آنے کے لئے مترجم کو بے حد ریاضت درکار ہوتی ہے اور پھر بھی سنبھل سنبھل کر یہ سارے امور انجام دینے ہوتے ہیں تبھی ترجمہ یقیناً ایک فن بنتا ہے۔

چاہے کوئی قوم ہو دنیا میں اس کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ ادب اور علوم میں ترجمہ کا سہارا لیا جائے، اس سے اس قوم کی ذہنی اور علمی اعتبار سے یقینی طور پر ترقی ہوتی ہے اور ذہنوں کی وسعت اور شعور کی بالیدگی ہوتی ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ دنیا میں ہر انسان کا معیار الگ ہوتا ہے۔ ہر ایک کا علم اور اس کا تجربہ الگ ہوتا ہے۔ ہر ایک کے کمالات میں فرق ہوتا ہے۔ اس میں کوئی نکل جاتا ہے اور کوئی پیچھے رہ جاتا ہے۔ جو قومیں آگے بڑھی ہوئی ہیں یا جو آگے بڑھ رہی ہیں ان کے علوم و فنون کو سمجھنے کا واحد راستہ ترجمہ ہی ہوتا ہے۔ یقیناً دنیا میں ان گنت بولیاں اور زبانیں موجود ہیں۔ ان سب کو سیکھنا تو انسان کے بس سے باہر ہوتا ہے مگر ان سب کو چھوڑا بھی نہیں جاسکتا۔ انسان ان سے استفادہ کرنا چاہتا ہے اس لئے ترجمہ ضروری ہو جاتا ہے جس کے ذریعہ ترقی یافتہ اقوام کی تہذیب، علوم، فنون، ہنر، قصے، کہانیاں، داستانیں، ادب، گیت، سنگیت، خیالات، تصورات، نظریات اور زمانے کی رفتار وغیرہ کا پتہ چلتا ہے یہی وجہ ہے کہ سارے بڑے مفکرین، ماہرین فن اور محققین کی خدمات و نظریات سے ہم ترجمہ کے ذریعہ ہی واقفیت حاصل کرتے ہیں بلکہ ان کی اصل شہرت کا راز ہی ترجمہ بن چکا ہے اور اسی طرح زبانیں خود ترجمہ کی بدولت معرضِ وجود میں آتی ہیں اس لئے کہ یہ نظریہ بھی اہم ہے کہ ہر نیا تجربہ اور ہر نیا علم اپنے ساتھ نئی زبان کو لاتا ہے۔ نئے الفاظ کو جنم دیتا ہے۔ غرض ترجمہ کے ذریعہ انسان دوسروں سے متاثر ہوتا ہے اور ان سے لطف اندوز ہوتا ہے اور فائدہ اٹھاتا ہے۔

ان ساری باتوں کے ساتھ یہ ضروری امر ہوتا ہے کہ فائدہ اسی وقت اٹھایا جاسکتا ہے جبکہ ترجمہ ہو اور ترجمہ مترجم کی ذمہ داری ہوتی ہے اور اس ذمہ داری میں کئی خصوصیات شامل ہوتی ہیں جنھیں ایک مترجم کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ اس میں زبان و بیان، تراکیب و استعارات، تشبیہات و تعبیرات، محاورات، کہاوتیں اور روزمرہ یا تہذیب و تمدن کی منتقلی میں کئی مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور یہ کہ مترجم کو ترجمہ کو ترجمہ ہی سمجھنا ہوتا ہے اس لئے کہ یہ بات تو لازم ہے کہ ترجمہ ترجمہ ہی ہوتا ہے اصل نہیں ہوتا ہے اسی لئے بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا یا ترجمہ میں اصل کی بات نہیں آسکتی۔ یہ بات ایک طرح سے درست ہے۔ ورنہ ترجمہ اصل ہو جائے گا تو ترجمہ نہ رہے گا۔ غرض ترجمہ میں ترجمہ پن ہونا چاہئے۔

البتہ ترجمہ میں لطف کے عناصر بڑھنے کے لئے اس میں تخلیق کا عنصر آنا چاہئے اور تخلیقی شان بھی جھلکنی چاہئے۔ باقی یہ بات طئے ہے کہ طبع زاد مواد طبع زاد ہی ہوتا ہے اور ترجمہ ترجمہ ہی ہوتا ہے۔ تخلیق الگ ہوتی ہے اور ترجمہ الگ ہوتا ہے۔ دونوں کے رنگ میں فرق ہوتا ہے اور اسے ملحوظ بھی رکھنا چاہئے۔

اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ترجمہ سے اصل مقصود اصل زبان کے مواد سے واقفیت ہوتی ہے کہ آخر اس میں کیا مطلب اور کیا مفہوم و منشاء ہے، اور کس طرح کا مواد ہے اور اس سے کیا بات معلوم ہو رہی ہے۔ یعنی مفہوم اصل ہوتا ہے اگر اسے سمجھ لیا جائے تو بات بن جاتی ہے اور گوہر مقصود ہاتھ آجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تقابلی ادب سے زیادہ ترجمہ پر توجہ دی جارہی ہے اور ترجمہ کی مانگ بڑھ رہی ہے اور اس کے مطالبہ میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ادب اور شاعری کا ترجمہ ناممکن تو نہیں ہوتا مگر نہایت دشوار بھی ہے اس لئے کہ وہاں پوری بات عبارت یا متن یا اصل زبان میں نہیں ہوتی بلکہ بین السطور میں بھی بہت کچھ ہوتا ہے یا اشاروں، کنایوں اور رمز کی کیفیات میں بھی بہت کچھ کہا جاتا ہے جس کی منتقلی ہدفی زبان میں کافی مشکل ہو جاتی ہے بلکہ یہ منتقلی ایک مترجم کے لئے کسی طرح چیلنج سے کم نہیں ہوتی ہے۔ غرض یہ بہت حساس اور پیچیدہ مسئلہ ہوتا ہے۔

عصرِ حاضر میں ترجمہ کی ضروریات میں کافی فرق واقع ہو رہا ہے اور اس کے مسائل میں اضافہ آئے دن ہوتا جارہا ہے۔ انسان یا کوئی ماہرِ فن جسے دونوں زبانوں پر دسترس ہو وہ ترجمہ کا عمل انجام دیتا ہے اس کے علاوہ عصری جدید وسائل و ذرائع میں اضافہ کی بناء پر مشینی ترجمہ کی کوشش بھی ترقی کے راستہ پر گامزن ہے اگرچہ کہ اس میں کافی دشواریاں ہیں اور بے انتہاء مسائل ہیں مگر یہ سرگرمی بھی آگے بڑھ رہی ہے اس طرح ایک زمانہ میں کبھی تخلیق ہی سب کچھ سمجھی جاتی تھی مگر اب ترجمہ اور اس کی سرگرمی کا عمل اتنا زیادہ آگے بڑھ رہا ہے کہ ترجمہ بھی اپنی اہمیت کو مکمل طور پر منوا رہا ہے۔ ترجمہ بھلے ہی اصل کا مکمل عکس نہ ہو لیکن وہ ایک ایسی ضرورت ہے کہ جس سے آج چھٹکارہ نہیں اس لئے کہ اسی کے ذریعہ علوم و فنون کے دائرہ میں اضافہ ہوتا جارہا ہے جو کہ دشوار ترین مسئلہ ہوتا ہے اور یہ مسئلہ چھوٹے چھوٹے عام فہم الفاظ سے بھی بسا اوقات پیدا ہوتا ہے۔ جیسے لفظ "You" ہے اس کا ترجمہ "تو" (صیغہ واحد حاضر) کے لئے بھی ہوتا ہے یا عزت دینے کے لئے "تم" کے لئے بھی ہوتا ہے اور "آپ" بھی ہوتا ہے۔ اور یہ ساری تہذیب واحترام اور عزت وتوقیر کے مفہوم کے لئے بھی ہوتا ہے اور اسی طرح اس سے شناخت اور اجنبیت کے مواقع بھی ظاہر ہوتے ہیں اس لئے کہ جس سے جتنا تعلق زیادہ ہوتا ہے وہاں "آپ" جیسے تکلفات کی ضرورت باقی نہیں رہتی بلکہ تم تو کیا" تو" سے بھی کام چلا لیا جاتا ہے۔ یہ بڑا نازک مسئلہ ہوتا ہے اور مترجم کو اس تہذیبی فضاء کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ ساری صورتِ حال مترجم کی ادب کے ماحول اور تاریخ و سماج و تہذیب سے واقفیت پر منحصر ہوتی ہے گویا یہ عمل اس کے فہم وادراک اور بیدار مغزی کا امتحان ہوتا ہے۔

اس تہذیبی فضاء کی منتقلی کے لئے مترجم کو جو دشواری پیش آتی ہے وہ زبان کے فرق سے تو ہوتی ہی ہے اسی طرح تہذیب کے علاوہ پیشہ کا مقام، جگہ، ملک اور سماج و مذہب وغیرہ کے فرق سے بھی ہوتی ہے جیسے دونوں ممالک کی زبان کا فرق تو ہوتا ہی ہے۔اس کے علاوہ خود دونوں قریبی ریاستوں میں یہ فرق ہوتا ہے۔ جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ان سارے مسائل کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اہم ہوتی ہے کہ عام بول چال کی زبان الگ ہوتی ہے اور تحریری زبان یا معیاری زبان الگ ہوتی ہے یعنی بولی جانے والی اور لکھی جانے والی زبان میں بھی فرق ہوتا ہے۔ لہٰذ مترجم کو ترجمہ کے عمل میں اس فرق کو بھی پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔

ترجمہ کرنے والے فرد کو ترسیل، تفہیم اور تخلیق پر بھرپور نظر رکھنی پڑتی ہے۔ تخلیق کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے ترسیل اور تفہیم کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ترسیل اور تفہیم میں لطیف سا فرق ہے جو اہلِ نظر پر مخفی نہیں مگر ترسیل تو کوئی بھی شئے کرتی ہے دراصل تفہیم کا فرق ہوتا ہے اور ہر ایک کی تفہیم الگ الگ ہوتی ہے اس لئے کہ ہر ایک کی ذہنی سطح یکساں نہیں ہوتی اور ہر ایک کے ملبغ علم میں بھی فرق ہوتا ہے اسی کے لحاظ سے تفہیم ہوتی ہے اس میں اسلوب کو بھی پیشِ نظر رکھنا ہوتا ہے اس لئے کہ ہر ایک ادیب اور شاعر کا الگ الگ اسلوب ہوتا ہے جسے ترجمہ میں ملحوظ رکھنا ہوتا ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ میر کا اسلوب الگ ہے، غالب کا اسلوب الگ ہے، اقبال اور فیض احمد فیض کا اسلوب الگ ہے۔

اس موقع پر یہ بحث بھی چھڑ جاتی ہے کہ آیا اصل زبان کی تہذیب اہم ہوتی ہے یا ہدفی زبان کی؟ یہ مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے کہ زیادہ فوقیت کس کو دیا جائے؟ آج جب کہ مختلف تہذیبوں پر زور دیا جارہا ہے یہ مسئلہ اور بھی نازک ہو جاتا ہے لیکن اتنی بات واضح ہے کہ اصل زیادہ توجہ جس نکتہ پر دی جانی چاہئے اس پر دینی چاہئے۔ غیر ضروری امور پر زیادہ توجہ نہیں دینی چاہئے اگر وہ بھی اہم ہوں تو پھر مترجم کی اپنی صوابدید پر موقوف ہے۔

انتقالِ فکر کے مختلف پہلو:

ایک زبان کے مواد کو دوسری زبان میں منتقل کرنا ہی ترجمہ کا عمل کہلاتا ہے اس منتقلی کے عمل میں کئی پہلو قابلِ توجہ ہوتے ہیں جیسے مترجم کی ذات، قابلیت، دونوں زبانوں پر دسترس، ترجمہ کی نوعیت، کیفیت، اصل زبان اور ہدفی زبان کی خصوصیات، زبانوں کا پسِ منظر، منتقل کئے جانے والے مواد کا پس منظر، قاری کی ذہنی اور علمی سطح، اصل اور ہدفی زبان کا اسلوب، مترجم اور قاری کا مذہب و مسلک یا عقائد و مذہبی جذبات، زمانہ، مقام، سوسائٹی اور تہذیب کا منظر نامہ جو قاری اور مترجم سے متعلق ہوتا ہے۔اس میں وہ محرکات بھی اہم ہوتے ہیں جو ایک مترجم کو ترجمہ یا مواد کی منتقلی کے لئے مہمیز کرتے

ہیں اور اس کا مقصد بھی نہایت اہم ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ قابل قدر مواد کی اہمیت ہدفی زبان میں زیادہ ہوتی ہے جب کہ یہ ممکن ہے کہ اصل زبان میں اس کی اس قدر اہمیت نہ ہو۔

مذکورہ محرکات اور اسباب میں یہ بات بھی اہم ہے کہ مترجم کس تہذیب کا دلدادہ ہے؟ اصل زبان کی تہذیب کا والا وشیدا ہے یا ہدفی زبان کا؟ پھر یہ کہ وہ قارئین کو کیا تاثر دینا چاہتا ہے ان کے بارے میں؟ اور یہ کہ انھیں وہ کس قدر مطمئن کرتا ہے؟ یہ کافی پیچیدہ مسائل ہیں اور ان اثرات کا فرق یہ واقع ہوا کہ مختلف جامعات میں تہذیب و تمدن سے متعلق شعبہ جات قائم ہو چکے ہیں یا اس مضمون کو اس کی اہمیت کی بنا پر خصوصی طور پر شامل کر لیا گیا ہے۔ اس طرح ادب، تاریخ ،لسانیات، اسلوبیات وغیرہ کے ساتھ ساتھ تہذیبی نوعیت بھی کچھ کم اہمیت کی نہیں ہے۔ تہذیبوں کی درست منتقلی اس قدر اہم مسئلہ ہے کہ اس کے ذریعہ دو تہذیبوں کے افراد جو الگ الگ تھے وہ قریب آ سکتے ہیں اگر مترجم اپنی ذمہ داری بحسن و خوبی ادا کرے۔ زبانوں کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے اسے تہذیبوں کی یگانگت کے ذریعہ ختم کیا جا سکتا ہے اس طرح ترجمہ دو زبانوں کی الگ الگ تہذیبوں کے درمیان روابط بڑھانے کا بھی اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ یہ روابط وہ ہیں جو فطری طور پر قریب ہونا چاہتے ہیں۔ آج کے دور میں تو خصوصی طور پر تہذیبوں کا فرق مٹتا نظر آ رہا ہے یا یہ کہ دو تہذیبیں آپس میں ملتی جا رہی ہیں۔ یہ دراصل اس فطری جذبہ کے تحت ہوتا ہے جو ترجمہ جیسے عوامل کی بنا پر پُر کشش ثابت ہوتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر زبان کا اپنا مخصوص مزاج و منہاج ہوتا ہے اور اس کی اپنی الگ ایک تہذیب ہوتی ہے، ایک لسانی کیفیت ہوتی ہے جس سے اس میں کوئی فن پارہ وجود میں آتا ہے تو اس میں تخلیق کی شان پائی جاتی ہے اور اگر اس تخلیق کا ترجمہ نہ ہو تو بات وہیں تک رہ جاتی ہے یعنی محدود رہ جاتی ہے۔ متعین اور مخصوص طبقہ یا مخصوص قارئین سے آگے بات نہیں بڑھتی ہے مگر جب اس تخلیق کا ترجمہ ہوتا ہے تو اس میں نئی جہات پیدا ہوتی ہیں اور اس کے نہ صرف نئے پہلو نکل آتے ہیں بلکہ تخلیق کی شان محدود حلقہ سے نکل کر لامحدود افراد کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ترجمہ بھی خود اپنی جگہ ایک تخلیق ہوتا ہے مگر وہ اصل تخلیق میں نئے پہلو نکالنے کا محرک ثابت ہوتا ہے۔ پھر یہ مواد دوسروں تک پہنچتا ہے تو قارئین کا ذی علم و بیدار مغز طبقہ اس کو آگے بڑھاتا ہے اور اس میں کوئی بات پیدا کر دیتا ہے۔

تشخص اور اقدار کے سلسلہ میں بھی ترجمہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یقیناً انسانوں کے مابین یا ان کی تہذیبوں کے درمیان کافی فرق واقع ہوا ہے جس کی وجہ سے فاصلے پیدا ہو گئے ہیں مگر ترجمہ یہ بتاتا ہے کہ کہاں کہاں یہ فاصلے ختم کئے جا سکتے ہیں اور کہاں کہاں رفاقت کے لئے قدم بڑھایا جا سکتا ہے یعنی مشترک اقدار کے سلسلہ میں بھی یہ روشنی فراہم کرتا

ہے اور انسان دوستی کی فضا ہموار کرتا ہے۔ یہ فضا بسا اوقات بعض مقامات پر سیاست کی وجہ سے خراب ہو جاتی ہے اور جس کے نتیجہ میں بھائی چارگی کی فضا مکدر ہو جاتی ہے تو ترجمہ ان سب سے قطع نظر انسانیت دوستی کے نئے پہلو سامنے لاتا ہے اور تہذیبی اشتراک کے ماحول کو سازگار بنا دیتا ہے۔

اس میں دو سطحیں اہم اور بنیادی ہوتی ہیں جسے آفاقی تشخص اور مقامی تشخص کہا جا سکتا ہے۔ چاہے آفاقی معاملہ ہو یا مقامی سطح کا معاملہ ہو سماج کا طاقت ور طبقہ ہو یا کمزور طبقہ ہو ہر کوئی آج ترجمہ کے ذریعہ قریب ہوتا جا رہا ہے اور اب ایک مرکز پر آ رہے ہیں اس طرح سماج کے مختلف طبقات کے درمیان بہترین روابط پیدا کرنے کا کام یہ انجام دیتا ہے۔ چوں کہ ماحول و معاشرہ میں مختلف افراد کے درمیان جو فرق ہوتا ہے اس کے بنیادی عناصر میں مذہب، مسلک، عقائد، رسوم و رواج، تہذیب و تمدن یا ثقافت، لب و لہجہ، اظہار کا جداگانہ انداز، نظریات اور زندگی کے دیگر طور طریق میں فرق ہوتا ہے اور اسی فرق کی بناء پر افراد کے درمیان مماثلت نہیں ہوتی ہے یا سماجی ہم آہنگی پیدا نہیں ہوتی ہے مگر ترجمہ یہ اہم کام بھی انجام دیتا ہے اور ایک کو دوسرے سے قریب لاتا ہے اور اختلافات کو دور کر دیتا ہے اور قربتیں بڑھاتا ہے۔ سب سے اہم کوشش تراجم ہی کے ذریعہ ہوا کرتی ہے۔

اپنے تشخص کی حفاظت اور اس کی برقراری کی فکر اچھی بات ہے مگر اس کی وجہ سے جو فاصلے پیدا ہو گئے ہیں وہ ترجمہ کے ذریعہ دور ہو جاتے ہیں، فاصلے کم ہوتے ہیں اور رفاقت کے نئے نئے پہلو نکل آتے ہیں۔ جیسے کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے فلاں قوم کے بارے میں ترجمہ کے ذریعہ واقفیت حاصل کی۔ اس کے نتیجہ میں مجھے پتہ چلا کہ اس قوم میں ایسی تہذیب ہے وغیرہ جو مجھے پسند ہے اور میں بھی اسی کا قائل ہوں اور اسی نوعیت کے طور طریق جاری رکھنا چاہتا ہوں یہ بات کہہ کر گویا وہ شخص ترجمہ کی بدولت اس تہذیب سے قریب تر ہونے کی جسارت کر رہا ہے جو اس کی اپنی صوابدید پر موقوف ہے۔ یہ تبدیلی تراجم کے ذریعہ ہوتی ہے اسی طرح دونوں ممالک کے نمائندے یا اربابِ اقتدار یا اربابِ مجاز اپنا تشخص باقی رکھتے ہوئے بھی رفاقت کے پہلو تلاش لیتے ہیں جو ان کے درمیان ترجمہ کا ہی کمال ہوتا ہے۔

ترجمہ اور زبان کا پہلو:

عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جو بڑی زبانیں ہیں پہلے ان میں تراجم ہوتے ہیں پھر ان کی اہمیت کے پیش نظر دیگر زبانوں میں تراجم ہوتے ہیں جو علاقائی زبانیں ہوتی ہیں جیسے ہندوستان میں بڑی زبانیں سمجھی جانے والی صرف دو ہی زبانیں نظر آتی ہیں۔ ۱) انگریزی ۲) ہندی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی زبان سے پہلے ترجمہ انگریزی یا ہندی میں زیادہ ہوگا پھر اس

کے مختلف علاقائی زبانوں میں یہ تراجم الگ الگ طور پر ہوتے ہیں۔ لہٰذا انگریزی اور ہندی سے اردو، تلگو، کنڑ اور دیگر زبانوں میں یہ تراجم کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ یہ سب تفریق دراصل انسانوں ہی نے کی ہے۔ یہ دراصل زبانوں کے مانوس یا غیر مانوس ہونے کا ہی مسئلہ ہے ورنہ زبان کوئی چھوٹی بڑی نہیں ہوتی ہے۔ مانوس یا غیر مانوس ہونے کے نتیجہ میں کسی کا دامن بھرا ہوتا ہے اور کسی کا خالی خالی ہوتا ہے۔

موجودہ دور میں جہاں ماہرین زبان موجود ہیں وہیں زبان اور اس کی نزاکتوں کو بھرپور نہ جاننے والے بھی ہیں جو مکمل طور پر صورت حال سے آگاہ نہ ہونے کے باعث کچھ کا کچھ ترجمہ کر دیتے ہیں مگر ترجمہ اتنا آسان ہر گز نہیں ہے اس میں (انداز و آہنگ) لطف کی فضاء، معنی و مفہوم، ترسیل و تفہیم، تہذیب و ثقافت اور تشخص و معنی آفرینی پیدا کرنے کے لئے مترجم کو کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے جنھیں ہر گز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی ہی بہت ساری دشواریوں کی وجہ سے کبھی لفظی ترجمہ کو اہمیت دے دی جاتی ہے جو اگرچہ کہ زیادہ درست نہیں مگر سائنسی علوم میں اس طریقہ کار کو ترجیح دی جاتی ہے۔

ترجمہ میں اسلوب کی منتقلی کے مسائل:

جیسے تنقید کی اقسام میں سے اسلوبیاتی تنقید کا ذکر ملتا ہے بعض ماہرین زبان نے اسی طرح اسلوبیاتی ترجمہ کا ذکر کیا ہے۔ جیسے دیویندر اسر نے اپنے مضمون" ترجمہ، فن اور نظریہ" میں یوں لکھا ہے:

> "ماخذ زبان ہو یا ہدف زبان، اسلوب لسانیاتی ترجمے پر منحصر ہے۔ ترجمہ کا تعلق زبان سے ہے اور زبان کا تعلق اسلوب کے محرکات سے ہے۔ جب ہم اسلوبیاتی تنقید کا ذکر کرتے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اسلوبیاتی ترجمہ کا ذکر کیوں نہیں کرتے۔ کسی بھی ادیب یا فلسفی کی شناخت اس کے اسلوب سے ہوتی ہے نا کہ محض معنیات سے"۔[۳]

یقیناً یہ بات درست بلکہ واضح ہے کہ قلم کار یا مصنف و ادیب اور شاعر کی پہچان اس کے اپنے اسلوب سے ہوتی ہے جس میں انفرادیت و ندرت ہوتی ہے جیسے محمد حسین آزاد کا اسلوب، رشید احمد صدیقی کا اسلوب، مولانا آزاد کا اسلوب، مولانا عبدالماجد دریابادی کا اسلوب اور شعراء میں میر، غالب، اور اقبال ہر ایک کا اسلوب منفرد ہے، جداگانہ ہے۔

غرض مترجم کو اصل زبان کے اسلوب کی منتقلی کے مسائل سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے ورنہ اگر مترجم اسے نظر انداز کر دے اور اس کی انفرادیت اور اس کی فضاء کو چھوڑ بیٹھے تو وہ اس سے انصاف نہیں کر سکتا ہے۔ اصل کے اسلوب

میں جو لطف اور جمالیاتی انداز ہوتا ہے وہ ترجمہ میں بھی جھلکنا چاہئے تاکہ قاری کو اصل زبان کے ادیب یا شاعر و قلم کار کا مزاج و منہاج اور اسلوب سمجھ میں آجائے اسی لئے مترجم کو دونوں زبانوں پر دسترس ہونے کا نظریہ نہایت اہمیت کا حامل ہے بلکہ یہ ترجمہ کے باب میں پہلی شرط کے مترادف ہے تاکہ ترجمہ میں لطف آفرینی کے عناصر بڑھیں یہ اور بات کہ کبھی مترجم کو ترجمہ میں مداخلت کے عمل سے بھی گزرنا پڑتا ہے جہاں جہاں ضرورت محسوس ہو اور یہ مداخلت مختلف لحاظ سے ہوتی ہے مگر اس میں بھی بنیادی طور پر مترجم اسلوب کی انفرادیت کو برقرار رکھنے کوشش کرے۔

اس موقع پر یہ بات بھی اہم ہے کہ عصرِ حاضر میں خصوصاً علم وادب میں تشخص کی فضاء کچھ زیادہ ہی بڑھتی جارہی ہے اور اسی کے اعتبار سے تراجم ہورہے ہیں یا اپنے نظریات کے اعتبار سے اور تشخص کی دھاک جمانے کی بنیاد پر ترجمے ہورہے ہیں اور علم و ادب کے معاملات میں گروپ ازم کی فضاء چل پڑی ہے۔ اس کے لحاظ سے مناسب ہوں تو ترجمے ہوتے ہیں ورنہ نہیں یا وہ مناسب نہیں سمجھتے اس سے یہ بھی اجتناب کرتے ہوئے صالح روایات پر کاربند ہونا چاہئے اور اسلوب کی منتقلی مناسب انداز میں نہایت سلیقہ وقرینہ سے کرنی چاہئے۔

یہ خیال بھی بڑا درست اور اہم نظر آتا ہے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں ترقی کے خواب کوئی قوم اسی وقت پورے کرسکتی ہے جب کہ وہ اصل زبان کے علوم و معارف کو راست پڑھنے کی فکر کرے اور اسے سمجھ کر اس کے تقاضوں کے مطابق عمل پیرا ہو یا یہ کہ دوسری صورت یعنی وہ تراجم سے مدد لے اور تراجم کے توسط سے اصل علوم و معارف کو سمجھے اور پڑھ کر یا سمجھ کر آگے بڑھے اور اپنے خواب شرمندہ تعبیر کرے۔ یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ ترجمہ بین العلومی ہونے کی بناء پر اس کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے۔

ترجمہ کے عمل میں دشواریاں ضرور ہیں اور ایک مترجم کو جیسا کہ سطور بالا میں واضح کیا گیا اور یہ بہت بدیہی بات ہے کہ کئی مسائل سے گزرنا ہوتا ہے مگر اس کے باوجود ترجمہ کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ اگر یہ ترجمہ کا وسیلہ نہ ہوتا تو علوم و فنون اور معارف سکڑ کر رہ جاتے اور ادب وعلوم کا دائرہ اس قدر وسعت اختیار نہ کرتا جیسا آج ہوگیا ہے۔

دنیا کے حالات میں بڑی تیزی سے تبدیلی آرہی ہے۔ سیاسی و معاشی حالات بدل رہے ہیں۔ معاشرتی احوال میں تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں اور ادب میں نئے نئے نظریات پیدا ہورہے ہیں، علوم میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ یہ رفتار ہر علم و فن کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ نئی نئی اصطلاحیں وجود میں آرہی ہیں، الفاظ کا معنی و مفہوم بدل رہا ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ گلوبلائزیشن کے اثرات پورے عالم کو محیط ہیں۔ یہ سارے حالات اور تبدیلی کے امور سے ایک مترجم کو واقف ہونا نہایت

ضروری ہوتا ہے ورنہ وہ ترجمہ کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا ہے۔ جس قدر نئی چیزیں وجود میں آرہی ہیں، آسانیاں پیدا ہو رہی ہیں مگر اسی کے ساتھ ساتھ دشواریاں بھی راہ پا رہی ہیں۔

ادبی ترجمہ کے مسائل:

یوں تو ہر فن کا ترجمہ اپنی نزاکتیں رکھتا ہے مگر خصوصیت کے ساتھ ادب کے ترجمہ میں یہ مسائل اور بڑھ جاتے ہیں۔ مترجم کو اس ماحول کو خود پر طاری کرنا ہوتا ہے جس میں اصل زبان کا فن پارہ موجود ہوتا ہے۔ یہ فکری اعتبار سے بھی اور جذباتی اعتبار سے بھی ضروری ہوتا ہے یعنی مترجم کو ترجمہ کرتے وقت اصل زبان یا تخلیق کی روح کو سمجھنا ہوتا ہے اور پورے اس ماحول پر نظر رکھنی پڑتی ہے جس میں وہ فن پارہ تحریر کیا گیا ہے۔ اس لئے مترجم کو بار بار اسے پڑھنا ہوتا ہے اور مختلف زاویوں سے غور و فکر کرنا اور حقائق و نظریات کو سمجھنا ہوتا ہے۔ اس بظاہر کرب مگر لطف آمیز کیفیت سے گذر کر جب مترجم ترجمہ کا عمل انجام دیتا ہے تو اس میں تخلیق کی سی شان جلوہ گر ہوتی ہے اس کے زمان و مکان کی واقفیت کے ساتھ ساتھ مترجم کو تاریخ، پس منظر، حقائق، نظریات اور بیانیہ کو بھی سمجھنا ہوتا ہے۔ بسا اوقات اصل کے متون بہت سے ہوتے ہیں ان سب پر بھی گہری نظر درکار ہوتی ہے تبھی ترجمہ کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔

اگر مختلف متون مترجم کے سامنے ہوں تو وہ ان میں درست، معتبر اور مستند نسخہ کا پہلے انتخاب کرے گا۔ پھر اس کے جذنے اور روح کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ پھر اس میں اگر ضرورت ہو تو مترجم مداخلت سے کام لے گا۔ ان سب کے ساتھ ساتھ مناسب اسلوب بھی ضروری ہوتا ہے تاکہ روانی آئے۔ ورنہ ترجمہ اگر اکھڑا اکھڑا ہوگا یا زیادہ لفظی ہو جائے تو اس میں لطف کی کیفیت پیدا نہ ہوگی۔ بعض انھیں مشکلات کی بناء پر ترجمہ کو طبع زاد تخلیق سے زیادہ مشکل اور دشوار کہا گیا ہے۔ خلاصہ کے طور پر یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ دیگر بہت سی نزاکوں کا خیال رکھتے ہوئے ترجمہ میں رواں اسلوب، معنی و مفہوم اور مطلب کی درست منتقلی ہو اس طور پر کہ اس میں بھی اصل کا سا لطف پیدا ہو جائے یہ الگ بات کہ اصل کی بات ترجمہ میں نہیں آسکتی مگر ترجمہ بھی لطف آمیز ثابت ہو اس کے لئے مترجم کو اس قدر زیادہ محنت کی اور قابلیت کی داد دینی پڑتی ہے۔

اگر مترجم ادب میں فکشن کا ترجمہ کر رہا ہو تو اس میں خاص طور پر تہذہب اور اسلوب کی اہمیت ہوتی ہے جس کو پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔ ہر فکشن میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھنی ہوتی ہے کہ اس میں تہذیب اور اسلوب کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ اگر مترجم یہ ملحوظ نہ رکھے تو وہ خاص طور پر ادب کے ترجمہ کے ساتھ انصاف نہیں کر پائے گا۔ اس کی

مثال میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو کے بعض ادیب وہ حضرات بھی ہیں جن کو اردو کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں جیسے انگریزی، ہندی، اور بعض مقامی زبانیں بھی خوب نہ صرف آتی ہیں بلکہ انھیں اس پر بھرپور عبور حاصل ہے۔ ایسے ادباء کی تحریروں کا ترجمہ کرتے ہوئے مترجم کو ان کے مبلغ علم کا خاص طور پر خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ جیسے مشتاق احمد یوسفی جو اردو کے مشہور طنز و مزاح نگار ہیں ان کی تحریروں میں بلا تکلف انگریزی الفاظ اور بعض مقامات پر پنجابی الفاظ بھی ملتے ہیں اس لئے مترجم کو ان سب کا خاص خیال رکھنا ہوتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ فکشن کے ترجمہ کی بھی بہت سی نزاکتیں ہوتی ہیں ادب میں خاص طور پر شاعری کے ترجمہ کی تو اس سے بھی زیادہ نزاکتیں ہوتی ہیں اسی لئے اس کے ترجمہ کو سب سے مشکل قرار دیا گیا اس لئے کہ مترجم ترجمہ ان الفاظ کا کر سکتا ہے یا عموماً کرتا ہے جو متن یا اصل زبان میں ہوتے ہیں مگر شاعری میں یہ معاملہ رمز و ایماء اور کنایہ کا ہوتا ہے تو مترجم کو اس پوری فکر، پورے احساس اور جذبے کو ترجمے میں منتقل کرنا پڑتا ہے جو واقعی نہایت دشوار امر ہے۔ شاعری کا ترجمہ اس لئے کئی مشکلات کو لئے ہوئے ہوتا ہے پھر اس میں منظوم ترجمہ اور زیادہ مشکلیں کھڑی کر دیتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اصل زبان کا محاورہ ہدف زبان میں نہیں ملتا ہے یا اس کی تہذیب کا فرق ہوتا ہے یا صوتیات کا مسئلہ ہوتا ہے یا قواعد و اسلوب کے مرحلے ہوتے ہیں یا کبھی شاعری میں تشبیہات و استعارات کا استعمال ہوتا ہے جن کا ترجمہ آسان کام نہیں ہوتا یا اس سے زیادہ مشکل مسئلہ اس وقت درپیش ہوتا ہے جب کہ شاعری میں صنائع بدائع موجود ہوں تو ان کی منتقلی ہدف زبان میں یقیناً آسان نہیں ہوا کرتی ہے اس لئے شاعری کا ترجمہ پیچیدہ ہوتا ہے۔

ادب کی دیگر اصناف چاہے وہ نثر سے متعلق ہوں یا شاعری سے متعلق ہوں ان کا ترجمہ نہایت مہارت اور مشاقی کا تقاضا کرتا ہے۔ قبل ازیں فکشن اور شاعری کے ترجمہ کے مسائل کے بارے میں اختصار سے اظہار خیال کیا گیا۔ باقی دیگر اصناف بھی نزاکتوں کی حامل ہیں۔ مثلاً ڈرامہ ہے جس میں بول چال، روز مرہ، ضرب الامثال، مقامی محاورے اور اقوال وغیرہ بہت اہمیت کے ہوتے ہیں اس میں ماحول اور سماج اور زمان و مکان کے حالات کا گہرا مطالعہ یا ادراک ضروری ہوتا ہے تبھی ان کی درست منتقلی ترجمہ میں ممکن ہو سکتی ہے۔ جیسے قلعہ معلّی کی زبان، درباری زبان، درباری آداب و اطور، شاہانہ امور کا ترجمہ کرنا ہو تو اس پورے پس منظر سے واقفیت ضروری ہوتی ہے ورنہ اسے آج کی زبان اور عصرِ حاضر کے ماحول سے وابستہ کر کے ترجمہ سے انصاف نہیں کیا جاسکتا بلکہ معاملہ کچھ کا کچھ ہوتا ہے اسی طرح خواتین کے محاورے، ان کی مخصو

ص زبان اور اقوال جب مکالمہ کے انداز میں ترجمہ کے ذریعہ آئیں تو ساری نزاکتوں پر نظر ضروری ہوتی ہے اور وہ ساری اقدار کا منظر نامہ مترجم کو نظر میں رکھنا پڑتا ہے۔

مکالموں میں کرداروں کے طور طریق، عادات واطور، ذوق کا فرق، مبلغ علم اور تہذیب و تمدن وغیرہ کے لحاظ سے ترجمہ کرنا ہوتا ہے اسی سے ہر کردار کے درمیان فرق ہوتا ہے۔ اس میں امیر و غریب، شریف، اوباش، تاجر، معمولی پیشہ ور ،مزدور، شرابی، مذہبی ہر انسان اور ہر فردِ بشر کی صورتِ حال کا فرق بھی ہوتا ہے اسی کے اعتبار سے زبان اور تہذیب کی منتقلی کافی بیدار مغزی کا تقاضہ کرتی ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ عامیانہ زبان الگ ہوتی ہے۔ قوم کے سر کردہ، مہذب اور تعلیم یافتہ یا خصوصی طبقہ کی زبان الگ ہوتی ہے اسی کے اعتبار سے مترجم کو اس کی منتقلی کرنی ہوتی ہے یا جیسے طنز و مزاح کا سلوب اور اس کا انداز الگ حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ آج کے دور میں ممالک کے قریب آنے، ریاستوں کی قربت بڑھنے، معاش کی راہیں کھلنے، علوم و فنون کا دائرہ بڑھنے اور دونوں مختلف تہذیبوں کے ایک دوسرے میں مدغم ہونے وغیرہ امور کا واحد ذریعہ ترجمہ ہی ہے اسی لئے زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ ترجمہ کا شعور آئے دن بڑھتا جارہا ہے اور مختلف جامعات میں ترجمہ کے شعبوں کا آغاز ہو رہا ہے اور ترجمہ کے اصول و قواعد اور نظریات پڑھائے اور سمجھائے جارہے ہیں اور مترجمین کو تیار کیا جارہا ہے اور ترجمہ کو باضابطہ علم کی حیثیت سے پڑھایا جارہا ہے۔ اس سلسلہ میں مزید اضافہ کے امکانات ابھی موجود ہیں اور ترجمہ کے نظریات پر کافی کام باقی ہے تاہم جو کام ترجمہ سے متعلق ہوتے ہیں وہ بھی خاصے ہیں جن کا از سرِ نو جائزہ لے کر ترجمہ کے دامن کو مالا مال کیا جاسکتا ہے۔ ایسی بہت سی کتابیں ہیں جو ترجمہ شدہ ہیں اور جن کے مقدموں میں یا ابتدائی مضامین میں مترجمین نے ترجمہ کے مسائل اور دشواریوں کا ذکر کیا ہے اور بعض نظریات اہداف اور مقاصد کا ذکر کیا ہے جن پر تفصیلی و تحقیقی گفتگو کی جاسکتی ہے اور یہ کام محققین و اساتذہ بخوبی انجام دے سکتے ہیں تاکہ ترجمہ کے باب میں اضافہ ہو۔

حوالہ جات

(۱) ترجمہ کا فن اور روایت۔ مرتبہ، پروفیسر قمر رئیس۔ صفحہ نمبر ۱۸۸ ۔

(۲) ترجمہ کا فن اور روایت۔ مرتبہ، پروفیسر قمر رئیس۔ صفحہ نمبر ۷۷ ۔ ۷۸ ۔

(۳) ترجمہ کا فن اور علمی مباحث۔ صفحہ نمبر ۳۲ ۔ ۲۰۱۲ء ، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

باب سوم

اشاریہ سازی کی اہمیت

اشاریہ سازی کی اہمیت

اشاریہ سازی۔ تعریف، اقسام اور خصوصیات:

اشاریہ: یہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لفظی معنی اشارہ کرنا ہے اور اصطلاحی معنی میں حروف تہجی کی ترتیب کے اعتبار سے مضامین کی تفصیلی فہرست تیار کرنا اشاریہ سازی کہلاتا ہے۔ واضح رہے کہ لفظ اشاریہ عربی ہے اور "سازی" لفظ فارسی ہے۔ اس طرح یہ عربی اور فارسی کے دو لفظوں سے وضع شدہ ایک مرکب اصطلاح ہے۔ اشاریہ کو انگریزی زبان میں INDEX کہا جاتا ہے۔

اشاریہ سازی میں مصنفین کے ناموں اور مضامین کی فہرست کو خصوصیت کے ساتھ حروفِ تہجی کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے جس میں نظم و نثر پر مشتمل مختلف تخلیقات کا حوالہ دیا جاتا ہے اور اس میں کتاب، رسالہ، ماہنامہ، جریدہ اور ماہ و سال کا اندراج ضروری ہوتا ہے تاکہ ایک موضوع یا فن سے متعلق مختلف تحقیقی، تنقیدی اور تعارفی مضامین محققین کو یکجا فراہم ہو جائیں۔ چوں کہ تحقیق میں کتابیات کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور اشاریہ سازی بھی کتابیات ہی کے زمرہ کے تحت آتی ہے اس لئے اس کی بھی اہمیت و افادیت مسلمہ ہو چکی ہے۔ اشاریہ سازی کے ذریعہ مختلف علمی و ادبی شخصیات کے نام، مقامات، کتب اور مضامین ہی سامنے نہیں آتے بلکہ اس کے ذریعہ مختلف مفید معلومات بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔

سطور بالا میں اشاریہ کی تعریف سے دو باتیں خاص طور پر واضح ہوتی ہیں۔ (۱) مضامین کی تفصیلی فہرست (۲) حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب۔ یہ دونوں چیزیں اشاریہ سازی میں ملحوظ رکھی جاتی ہیں۔ مضامین کی تفصیلی فہرست میں دیگر جزئیات بھی شامل ہو جاتی ہیں جیسے صفحات کا نمبر، ماہ و سال اور مطبع وغیرہ جن سے قاری یا تحقیق کار کو باسانی مختلف مضامین اور تخلیقات و شذرات اور تحقیقات و تنقیدات کا پتہ چل جاتا ہے۔ اور اس میں خاص بات یہ ہوتی ہے کہ اشاریہ سازی کے عمل میں محقق کو مختلف پہلوئوں پر نظر رکھنی پڑتی ہے اور کثرتِ مطالعہ و وسعتِ مطالعہ کا ثبوت دینا ہوتا ہے مگر جب یہ سخت مرحلہ گزر جاتا ہے اور اشاریہ سازی ہو جاتی ہے تو اس سے دوسرے محققین کو بیک وقت یکجا مواد بآسانی فراہم ہو جاتا ہے اور اشاریہ سازی کا عمل دوسرے محققین کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوتا ہے اور وہ گویا صدہا معلومات کا نچوڑ

ہوتا ہے۔اس سے ایک سچے محقق کو وہی خوشی ہوتی ہے جو موسمِ گرما میں سخت پیاس کے احساس اور تقاضہ کے بعد ٹھنڈے پانی کے پینے سے میسر ہوتی ہے اور تشنگی دور ہوتی ہے۔

سطورِ بالا میں ذکر کردہ دو باتیں جو اشاریہ سے متعلق ہیں نہایت اہم ہیں۔اس سلسلے میں میں نے دیگر محققین کی پیش کردہ تعریفات بھی ملاحظہ کیں تاکہ اشاریہ سازی کی تعریف اور واضح ہو جائے۔چنانچہ جارج ایس بون نے اشاریہ کی جو تعریف کی ہے اس کے مطابق ایک اشاریہ ایک مکمل علمی اکائی ہے (مثلاً کتاب، سلسلہ، مطبوعات یا جلد نمبر رسالہ) نام، فنی اصطلاح، موضوع، مقام، فارمولہ، ہندسہ یا اسی طرح کے دوسرے اہم عنصر کی ایک مفصل الف بائی فہرست ہے جو ان صفحات کی نشاندہی کرتی ہے جن میں ان پر بحث کی گئی ہے۔جارج ایس بون نے بنیادی طور پر اشاریہ کی تعریف کے ساتھ ساتھ اس کی مختلف جزئیات یا متعدد صورتوں کو بیان کیا ہے جس میں الف بائی ترتیب ہوتی ہے۔

اردو کے مشہور محقق و مورخ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اشاریہ کی تعریف کرتے ہوئے اس کے مفہوم کی وسعت کا بھی ذکر کیا ہے۔ان کے مطابق اشاریہ وہ ہجائیہ یا طبقہ بند فہرست ہے جو کتاب کے آخر میں لگائی جاتی ہے تاکہ اس میں شامل مواد کا حوالہ تلاش کیا جاسکے۔وہ چیز کو سائنسی آلے میں اظہار کے لئے استعمال کیا جائے، سوئی، شہادت کی انگلی، جو چیز کسی حقیقت کی طرف توجہ مبذول کروائے۔

اس تعریف سے ظاہر ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اشاریہ کے معنی و مفہوم کی وسعت کی طرف نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ اشارہ کیا ہے اور مختصر مگر عمدہ وضاحت کی ہے۔ شان الحق حقی نے اشاریہ کی جو تعریف کی اس کا لب لباب یہ ہے کہ حوالے کی آسانی کے لئے حروفِ تہجی کے مطابق مرتب کی ہوئی فہرست۔انڈیکس۔اشاریہ بندی، اشاریہ تیار کرنا۔

اس تعریف میں شان الحق حقی نے اشاریہ کی مختصر تعریف اور مقصد (آسانی کی خاطر) بیان کیا ہے۔

اردو کی مشہور و مقبول اردو لغت" فیروز اللغات" میں مولوی فیروز الدین نے اشاریہ کی تعریف یوں لکھی ہے:

" کسی کتاب کے مضامین کی تفصیلی فہرست حروفِ تہجی کے اعتبار سے"۔[1]

انسائیکلوپیڈیا ویب سائٹ کے مطابق اشاریہ کی تعریف کے ضمن میں درج ذیل اہم معلومات ملتی ہیں:

"اشاریہ" سے مراد کتاب کے آخر میں یا رسالہ کی مکمل جلد کے آخر میں شامل وہ فہرست ہے جو کتاب، رسالہ، یا دیگر علمی شئے میں موجود معلوماتی اجزاء، الفاظ، نام، تصور کی نشاندہی اور ان تک

رسائی کے لئے حوالہ مقام، شناخت یا مقام کے ذکر پر مشتمل ہوتی ہے۔ حوالہ، مقام، ذکر عموماً صفحہ نمبر ہوتا ہے۔ ایک عام قاری اشاریہ سے کتاب کے آخر میں دئے اشاریہ سے مراد بالعموم رسائل میں شائع مضامین کے مرتب اشاریہ سے ہوتی ہے جو ایک متعین مدت کے وقفہ سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔[۲]

آگے یوں لکھا ہے:

برطانوی محکمہ معیار بندی نے اشاریہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔۔

"یہ کتابوں، رسائل یا دوسری علمی اکائی میں موجود لفظ، تصور یا شئے کے مقام ذکر تک رسائی کے لئے ایک متعین نظام ترتیب پر تشکیل دینا ہے۔ یہ مدخل Entry کے ایک ایسے تسلسل سے مرتب ہوتا ہے جو تصنیف میں مذکورہ ترتیب میں نہ ہو کر معلومات کے متلاشی کی لفظ، تصور یا شئے تک بہ سرعت رسائی کی خاطر کسی دوسری ترتیب مثلاً الف بائی پر مع حوالہ مقام ذکر مرتب ہوتا ہے۔"

اشاریہ دل گداز کے تحقیق کار محمد قمر سلیم نے ترقی اردو بورڈ کراچی کی تیار کردہ اردو لغت کے حوالہ سے اشاریہ کی تعریف یوں کی ہے:

" حروفِ تہجی کی ترتیب سے کتاب وغیرہ کے شروع یا آخر میں دی ہوئی فہرست جس میں کتاب کے مضامین اور دوسرے جزئیات کے حوالے اور صفحات درج ہوں"۔ [۳]

آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق انڈیکس (اشاریہ) کی تعریف درج ذیل الفاظ میں ملتی ہے:

"Definition of index-(in a book or set of books)an alphabetical list of names,subjects etc.with reference to the pages on which they are mentioned " [۴]

چنانچہ اس مندرجہ بالا تعریف میں بھی اشاریہ کی تعریف میں بھی وہی باتیں ملتی ہیں جو سطور بالا میں ذکر کی جاچکی ہیں کہ کسی کتاب کے مضامین کی الف بائی ترتیب جس میں نام اور موضوعات وغیرہ ملتے ہوں تاکہ ان صفحات وغیرہ کی طرف مراجعت کی جاسکے۔اسی طرح ڈکشنری ڈاٹ کام کے مطابق INDEX کی تعریف درج ذیل الفاظ میں ملتی ہے۔

" Index definition (in a nonfiction book monograph listing of names,places and topics along with the numbers of the pages on which" ۵

دراصل تحقیق ایک نہایت اہم مگر نازک عمل ہے اس لئے کہ اس عمل میں ہزاروں پُر خطر راستوں سے ایک تحقیق کار کو گزرنا پڑتا ہے اور صحیح نتائج تک پہنچنا ہوتا ہے اور یہ عمل کوئی آسان عمل نہیں ہے۔اس کے لئے مختلف علمی و ادبی اہم شخصیات، کتابوں، رسالوں، ماہناموں، جریدوں، اور کتب خانوں کی طرف مراجعت کرنی پڑتی ہے۔یہ الگ بات ہے کہ موجودہ دور میں دوریاں سمٹتی جارہی ہیں اور جدید ذرائع ابلاغ و وسائل کی بناء پر فاصلے کم ہوتے جارہے ہیں اس کے باوجود آج بھی تحقیقی کام مختلف دشواریوں کے بغیر ممکن نہیں ہوتا ہے اور یہ معرکہ بآسانی سرانجام نہیں پاتا ہے۔ایک محقق جب تحقیق کے عمل میں سر گرداں ہوتا ہے تو مواد کی فراہمی کا مسئلہ اس کے لئے ایک چیلنج بن جاتا ہے اور اس کو مختلف کتابوں کا مطالعہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔پھر اس میں دشواری یہ ہوتی ہے کہ کبھی وہ کتابیں دستیاب ہوتی ہیں اور کبھی نایاب و کمیاب ہوتی ہیں ایسی صورت میں تحقیق کا عمل مشکل ہو جاتا ہے۔مگر یہ بات بھی طئے ہے کہ تحقیق کا وزن و وقار کتابیات اور حوالہ جات پر منحصر ہوتا ہے جس کے ذریعے تحقیق کار کی محنت، مطالعہ کی وسعت اور جدوجہد کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔اس میں بھی ایک خاص بات یہ ہوتی ہے کہ عموماً کتابیں ایک مخصوص موضوع پر ہوتی ہیں جب کہ رسالوں اور ماہناموں میں مختلف موضوعات پر مشتمل مواد شائع ہوتا ہے ایسی صورت میں مطلوبہ مواد کو تلاشنا بہر حال دشوار ہو جاتا ہے۔ایسی بہت سی دشواریوں کا حل "اشاریہ سازی" کے ذریعہ ہو جاتا ہے۔ایک محقق کو مختلف شخصیات اور کتب خانوں کی جو سیر کرنی پڑتی ہے اس میں اس کی ہر طرح کی توانائی صرف ہوتی ہے جب کہ اشاریہ سازی کے عمل کے ذریعہ محقق کی نہ صرف سیرابی ہو جاتی ہے بلکہ اس کو ایک جگہ ہی اس کا مطلوبہ مواد سے متعلق مختلف ادیبوں اور قلم کاروں نے کیا کیا لکھا ہے، وہ سارے اہم مضامین و مقالات و تحریریں بیک نظر بیک وقت سامنے آجاتی ہیں۔اس لئے اشاریہ سازی کی اہمیت مسلمہ ہو جاتی ہے۔

اشاریہ سازی کا عمل دوسرے فنون کی طرح ارتقائی مراحل طئے کرتے ہوئے اب ایک مکمل فن کی شکل اختیار کر چکا ہے۔اسی لئے اردو زبان میں اس کی شروعات تاخیر سے ہوئی اور یہ بات مبنی بر حقیقت ہے کہ اس فن کی طرف اردو میں کم ہی توجہ دی گئی ہے البتہ زیادہ تر رسالوں اور ماہناموں کی اشاریہ سازی پر توجہ مبذول کی گئی ہے۔ہندوستان اور پاکستان میں اردو میں اشاریہ سازی کی روایت مستحکم ہو چکی ہے اور اس میں بھی خصوصاً گذشتہ چند برسوں سے تیزی آئی ہے اور اس روایت کو استحکام نصیب ہوا ہے۔

"اشاریہ سازی" تحقیق کی ایک اہم اور بنیادی منزل ہے بلکہ تحقیق میں اس کو رہبرِ اول کی حیثیت دی گئی ہے۔ چوں کہ موجودہ دور میں علوم و فنون کی جو ترقی ہو رہی ہے اس سے ہر کوئی واقف ہے۔آئے دن اہم مضامین، مقالات ، تحقیقی و تنقیدی اور معلوماتی مواد، اخبارات، رسائل و جرائد اور کتابوں میں شائع ہوتا جارہا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ ایک سمندر ہے جس میں سے مطلوبہ لعل و گوہر کو تلاشنا نہایت مشکل اور دشوار ہو جاتا ہے ایسے میں کتابیات، وضاحتی فہرست، اشاریہ سازی ہی حد درجہ ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں جس میں کم سے کم وقت میں محقق مطلوبہ مواد کو حاصل کر سکتا ہے اور جلد از جلد اپنی تحقیق کے مراحل طئے کر سکتا ہے۔

مختلف مضامین، عنوانات، شخصیات، علوم و فنون اور اہم پہلوؤں پر جب تک تحقیق نہ ہو اور جب تک ان تمام امور سے متعلق اشاریہ سازی نہ ہو تب تک صحت منداور مستند تحقیقی اور علمی و ادبی کام انجام نہیں دئے جا سکتے اسی لئے اردو کے مقابلہ میں انگریزی اور دنیا میں پائی جانے والی دوسری زبانوں میں یہ کام پہلے ہی شروع ہو چکے تھے اسی لئے ان زبانوں اور ان کے ادب و تحقیق کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا جارہا ہے ایسے میں اگر اردو پر نظر کی جائے تو مکمل مایوسی کی فضا تو قائم نہیں ہوتی ہے تاہم یہ صداقت ماننی پڑتی ہے کہ اردو میں نسبتاً یہ کام کم ہوا ہے۔

اشاریہ سازی کا آغاز وارتقاء:

جیسا کہ سطور بالا میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ اردو میں اشاریہ سازی بہت بعد میں در آئی۔اس سے پہلے انگریزی و دیگر زبانوں میں اس کا آغاز ہو چکا تھا۔البتہ یہ بھی حیرت انگیز بات ہے کہ اردو کی ابتدائی کتابوں میں اشاریہ کا التزام ملتا ہے جب کہ بعد کے ادوار میں یہ روایت مفقود ملتی ہے چنانچہ دہلی کالج سے شائع شدہ 1847ء کی کتابوں میں اشاریے ملتے ہیں۔ علاوہ ازیں حیاتِ جاوید نامی پریس 1901ء میں بھی اشاریہ ملتا ہے۔اسی طرح خود حیدر آباد دکن میں دارالترجمہ کی کتابوں میں بھی اشاریہ کا اہتمام ملتا ہے۔

البتہ یہ قابل ذکر بات ہے کہ اردو میں اشاریہ سازی پر کام دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلہ دیر سے شروع ہوا تاہم اس میں قابل لحاظ کام دستیاب ہے۔اس سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ اٹھارویں صدی میں رسائل کی اشاعت کی تعداد زیادہ بڑھنے لگی اور مضامین کی تعداد جب روز افزوں ہونے لگی تو اشاریہ ہی اس کی شاہ کلید تھا اور سائنسدانوں نے اس کی ضرورت کو محسوس کیا جس کی وجہ سے رسائل کی نہ صرف داغ بیل پڑی بلکہ اشاریہ سازی کے عمل کی شروعات ہوئی۔ چوں کہ کسی بھی موضوع پر کیا کام ہوا ہے اس کا جاننا از حد ضروری ہوتا ہے تاکہ سابقہ تحقیق اگر اطمینان بخش نہ ہو تو اشاریہ سازی کے ذریعہ اس کے تشنہ پہلوئوں پر نظر رکھی جاسکتی ہے یا تحقیق کے معیار کو بڑھایا جاسکتا ہے اور اس طرح اچھے سے اچھا کام کیا جاسکتا ہے۔اس اہمیت کے پیش نظر اشاریہ سازی کی شروعات ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ انگریزی اور دیگر ترقی یافتہ زبانوں میں اشاریہ کا فن کافی ترقی کر چکا ہے اور معیار و مقدار کے اعتبار سے بھی آگے بڑھ چکا ہے۔اس کے باوجود بھی اشاریہ سازی کے آغاز کا اعزاز و افتخار مسلمانوں ہی کو حاصل رہا ہے۔ ابتدائی نقوش کے طور پر ہم الفہرست ابن الندیم اور کشف الظنون وغیرہ کو پیش کر سکتے ہیں۔ مگر ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے دوسرے علوم کی طرح اشاریہ سازی سے بھی کسی قدر بے اعتنائی برتی اس لئے اس میدان میں بھی یوروپ نے اولیت کا دعویٰ کیا حالانکہ واقعیت اور صداقت اس کے برعکس ہے۔

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ اشاریہ سازی کے میدان میں مسلمانوں نے پہل کی اسی لئے ان کی بعض قدیم کتابوں میں اشاریہ کا طریقہ کار ضرور ملتا ہے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ اس کو ترقی کی معراج دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ماہرین نے عطا کی ہے۔اسی لئے انگریزی و دیگر زبانوں میں یہ کام بہت آگے بڑھ چکا ہے۔

اشاریہ سازی کے فن کی اہمیت کو سمجھنے والوں میں " لندن اسکول آف اورینٹل اینڈ آفریکن اسٹڈیز" کے لائبریرین جے ڈی پیرسن (J.D.Pearson) کا نام سر فہرست آتا ہے۔اس مستشرق نے اسلامی تعلیمات کے متعلق شائع ہونے والے مواد کو (جو یوروپی زبان میں ہے) کا ایک مخصوص نام یعنی Index Islamicus کے ذریعہ شائع کیا اسی طرح ایک اور مشہور محقق البرج افشار نے بھی ایران میں فہرست مقالاتِ فارسی کے نام سے اس نوعیت کا کام کیا ہے ۔علاوہ ازیں 1788ء میں لندن میں سائنسی علوم کی اشاریہ سازی کے لئے "انڈیکس سوسائٹی" کا قیام عمل میں لایا گیا اس طرح ہوتے ہوتے یہ علم لندن اور امریکہ میں آج بے حد ترقی یافتہ شکل میں ملتا ہے۔لندن لائبریری، برٹش میوزیم اور لائبریری آف کانگریس میں اس فن سے متعلق اہم مواد کو ترقی یافتہ انداز میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

اردو میں اشاریہ سازی:

اردو ادب میں اشاریہ سازی کی فکر کرنے والوں میں محمد ابراہیم، سید محمد عبداللہ، مولانا شبلی نعمانی، محمد سجاد بیگ، مولوی عبدالحق، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر انصار اللہ، ڈاکٹر عبدالقوی، ڈاکٹر بشیر حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر مظفر حنفی، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر جمیل احمد جالبی، جمیل اختر، محمد اطہر مسعود خان، اختر النساء، سید مصباح رضوی، محمد قمر سلیم، محمد اشرف کمال، ڈاکٹر سرور ساجد، ڈاکٹر محمد نور السلام، فاروق انصاری، ڈاکٹر معین الدین عقیل، مصباح العثمان، صابر کلوری، نوشاد منظر، عبدالعلیم قدوائی، یاسمین رفیق، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر عبدالغنی، شہاب الدین انصاری، محمد سہیل شفیق، زبیدہ بیگم، نثار احمد فیضی، شائستہ خان، بلقیس بیگم، سید سرفراز علی رضوی، عاندہ قریشی، ڈاکٹر یوسف فاتحہ خوانی، رابعہ سرفراز، مطیع اللہ خان، ڈاکٹر عطاء خورشید، ڈاکٹر امتیاز ندیم، خواجہ احمد فاروقی، محمد نعمان خان، قمر عباس، اختر اورنیوی، کاظم علی خان، غلام نبی کمار، سلمان عابد، صفدر رشید، ضیاء اللہ کھوکھر اور ڈاکٹر محمود احمد اسیر وغیرہ کے نام خصوصیت سے ملتے ہیں۔

اشاریہ سازی کے فن کو ترقی پر پہنچانے اور معیار عطا کرنے میں مندرجہ بالا شخصیات کا اہم کردار رہا ہے۔ پھر اس میں بھی رسائل کی اشاریہ سازی نے بازی جیت لی ہے چنانچہ درج ذیل رسائل کی اشاریہ سازی عمل میں آچکی ہے:

(1) آج کل — دہلی
(2) اردوئے معلی — علی گڑھ
(3) البلاغ — کلکتہ
(4) الہلال — کلکتہ
(5) الناظر — لکھنو
(6) تہذیب الاخلاق — علی گڑھ
(7) ساقی — دہلی
(8) سب رس — حیدرآباد، دکن
(9) شاہراہ — دہلی

(10) شب خون الٰہ آباد

(11) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ

(12) علی گڑھ میگزین

(13) معارف

(14) نیادور

(15) برہان

(16) روحِ ادب

(17) آج کل

(18) اُردو

(19) سچ

(20) تحریک ،دہلی

(21) مخزن

(22) دل گداز

(23) اخبارِ اردو

(24) مُعاصر

(25) ایوانِ اردو

(26) معیار

(27) شاہراہ

(28) صدق

(29) رسالہ جامعہ

(30)نیادور۔

علاوہ ازیں دیگر موضوعات سے متعلق اشاریہ سازی درجِ ذیل کتابوں کے ناموں سے ملتی ہے:

(1) اشاریہ اقبالیات۔اختر النساء۔1998۔

(2) جھارکھنڈ کی اردو کتابوں کا اشاریہ۔ڈاکٹر سرور ساجد۔2011

(3) اشاریہ کلامِ فیض۔ڈاکٹر معین الدین عقیل۔1977

(4) اشاریہ مکاتیبِ اقبال۔صابر کلوروی۔1948

(5) اُردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔1981

(6) اشاریہ کلامِ اقبال۔زبیدہ بیگم۔1996

(7) اشاریہ سرسید۔عاندہ قریشی۔2006ئ

(8) اشاریہ غالب۔شمیم جہاں۔1998

(9) اشاریہ ڈاکٹر طاہر تونسوی۔رابعہ سرفراز۔2004

(10) اشاریہ خدابخش لائبریری۔2009

(11) اردو رسائل کا اشاریہ۔ڈاکٹر عطاء خورشید۔1995

(12) اشاریہ کلامِ غالب۔خواجہ احمد فاروقی۔1970

(13) اشاریہ مضامین اقبال شناسی۔قمر عباس۔1996

اردو میں اشاریہ سازی کی فکر کرنے والوں میں درج ذیل اداروں اور جامعات کے نام بھی شامل ہیں:

(1) دہلی یونیورسٹی

(2) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(3) جامعہ ملیہ اسلامیہ

(4) مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

(5) گورکھپور یونیورسٹی

(6) اقبال اکاڈمی پاکستان

(7) اکاڈمی ادبیات پاکستان

(8) مقتدرہ قومی زبان۔اسلام آباد

(9) ادارہ تحقیقاتِ اسلامی (اسلام آباد)

(10) یونیورسٹی آف حیدر آباد

(11) جامعہ عثمانیہ۔حیدر آباد، دکن۔

اُردو میں اشاریہ سازی کے سلسلہ میں چند کتب خانوں کے نام بھی اہمیت کے حامل ہیں:

(1) آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز۔حیدر آباد۔دکن

(2) ادارہ ادبیاتِ اردو۔پنجہ گٹہ۔حیدر آباد۔دکن

(3) انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز۔نئی دہلی

(4) انڈین کونسل آف کلچرل ریلشنز۔نئی دہلی

(5) اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (کتب خانہ آصفیہ) حیدر آباد۔دکن

(6) خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری۔پٹنہ

(7) کتب خانہ دارالعلوم دیوبند۔یوپی

(8) ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری۔جامعہ ملیہ اسلامیہ۔نئی دہلی

(9) رامپور رضا لائبریری۔یوپی

(10) سالار جنگ میوزیم لائبریری۔حیدر آباد۔دکن

(11) کتب خانہ۔جامعہ عثمانیہ۔حیدر آباد۔دکن

(12) مولانا آزاد لائبریری۔علی گڑھ

(13) کتب خانہ ندوۃ العلماء۔لکھنوئ۔یوپی

(14) نیشنل لائبریری۔کلکتہ۔یوپی

(15) دارالترجمہ۔حیدر آباد۔دکن

اشاریہ سازی۔ مقاصد، خصوصیات و فوائد:

اشاریہ سازی کے مقاصد اور فوائد کے بارے میں تا حال جو تحریریں سامنے آئی ہیں ان کو ملاحظہ کرنے کے بعد درج ذیل مقاصد و فوائد سامنے آتے ہیں:

(1) تحقیقی مواد کی حصولیابی میں سہولت

(2) کم سے کم وقت میں مطلوب مواد تک رسائی

(3) متنوع مواد کا حصول

(4) بیک نظر بیک جا مختلف اہل قلم کی تحقیقی و تنقیدی تحریروں کی دستیابی۔

(5) الف بائی ترتیب کی بناء پر تلاشِ مواد میں سہولت۔

(6) حوالہ جاتی طریقہ کار میں سہولت (جیسے مضامین کی اشاعت، تاریخ، سن رسالہ اور کسی کتاب وغیرہ میں ہو)۔

(7) مختلف تحقیقی و تنقیدی مواد کی دستیابی کے ذریعہ آئندہ لکھے جانے والے مواد کی تیاری کی نشاندہی، اپنے نقطۂ نظر کے استحکام اور مضمون یا اصل موضوع تک سراغ یابی کا ذریعہ۔

(8) قدیم و جدید مواد کی فراہمی۔

(9) اشاریہ اپنے تحقیقی کام کو بہتر اور اچھے طریقہ سے کرنے کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔

(10) مختلف نئی معلومات کے استخراج کا ذریعہ بنتا ہے۔

(11) مواد کی عدم دستیابی کی پریشانیوں کا حل بنتا ہے۔

مذکورہ و مندرجہ بالا مختلف فوائد اور مقاصد کے حاصل ہونے کی بناء پر اشاریہ کو تحقیق کی " شاہ کلید" قرار دیا گیا ہے کہ جیسے خزانہ کی کنجی ہاتھ آنے سے خزانہ مل سکتا ہے اسی طرح کسی متعلقہ موضوع پر موجود و فراہم شدہ اشاریہ سے مختلف معلومات کا خزانہ ہاتھ آسکتا ہے جو ایک تحقیق کار کی بہت سی پریشانیوں کا ازالہ ثابت ہوتا ہے اور اسے مزید جانکاری کا موقع فراہم کرتا ہے۔ چوں کہ تحقیق کے نازک عمل میں محقق کو بہت سی کتابوں کا مطالعہ ضمناً بھی کرنا پڑتا ہے یا متعلقہ موضوع پر کام کرتے ہوئے بعض دوسری چیزوں اور موضوع سے خارج دوسری تحریروں اور کتابوں کو بھی پڑھنا پڑتا ہے

جس میں خاصا وقت چلا جاتا ہے اور احساس ہو نہیں پاتا مگر اپنا تحقیقی کام پیچھے رہ جاتا ہے اور اشاریہ ایسی تمام پریشانیوں سے بچا کر محقق کو سہولت فراہم کرتا ہے۔

اشاریہ سازی کیا ہے؟

اشاریہ سازی کے متعلق بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ یہ فن ہے اور بعض حضرات اسے سائنس قرار دیتے ہیں لیکن مناسب بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اشاریہ سازی کو آرٹ، فن یا سائنس کہہ سکتے ہیں چونکہ بنیادی طور پر اس طرح معلومات کی فراہمی اور رنگ ڈھنگ یا آہنگ ایک فن ہے اور اس کو آگے بڑھانے، ترقی دینے اور فروغ دینے کے جو طور طریقے مقرر کئے گئے ہیں وہ ضرور سائنس ہیں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اشاریہ سازی ایک فن بھی ہے اور سائنس بھی ہے۔

اشاریہ سازی کے چند اہم نکات:

1) اشاریہ سازی شخصیات، مقامات، کتابوں اور مصنفوں کے لحاظ سے کرنی پڑتی ہے۔
2) اشاریہ سازی کے لئے کتاب، رسالے اور اخبارات کے مندرجات کو ملاحظہ کرنا ہوتا ہے۔
3) اشاریہ سازی کی وسعت پر نظر رکھنی ضروری ہوگی۔
4) اشاریہ کے لئے مختص چیزوں وعدم مختص چیزوں پر نظر رکھنی ہوتی ہے۔
5) اشاریہ سازی کے لئے ابواب بندی کرنی ضروری ہوتی ہے۔
6) متعلقہ مواد کو مختلف زبانوں کے اعتبار سے بھی تلاش کرنے اور شامل کرنے پر نظر رکھنی ہوگی۔
7) دوسری زبانوں کے الفاظ کے اشاریہ پر بھی غور کیا جائے۔

علاوہ ازیں اشاریہ سازی کرتے وقت بعض دیگر بنیادی باتوں پر بھی توجہ دینی ہوتی ہے۔

جیسے:

☆ کتاب کی نوعیت ملحوظ رکھنی ہوتی ہے کہ وہ کس طرح کے مواد پر مشتمل ہے۔ آیا ایک طرح کا ہی مواد شامل ہے یا الگ الگ طرح کا مواد اس میں شامل ہے پھر یہ کہ وہ تکنیکی ہے یا نہیں؟ اور یہ بھی بات اہم ہے کہ وہ مواد ایک طرح کی زبان کا ہے یا الگ الگ زبانوں پر مشتمل ہے یا حقائق پر مشتمل ہے یا مجردات پر مشتمل ہے۔

☆ اشاریہ نگار کو یہ بات بھی پیش نظر رکھنی ہوتی ہے کہ اس کے پیش نظر کون کون لوگ ہیں؟ اس کے استعمال کرنے والے کس طرح کے افراد ہیں؟ یعنی وہ پیشہ ور ہیں؟ یا محققین ہیں؟ کم پڑھے لکھے افراد ہیں یا اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد ہیں اور وہ کن کے لئے بطور خاص اس کام کو پیش کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح ہر ایک کی خصوصیات کے پیش نظر آسانی فراہم کرنی چاہئے اور ترتیب کو دیکھنا چاہئے تاکہ استفادہ کرنے والے صحیح طریقہ سے استفادہ کر سکیں۔

☆ اشاریہ نگار کو یہ بات بھی ملحوظ رکھنی پڑتی ہے کہ اس کا اشاریہ کتاب کے ساتھ ہی شائع کیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا یا الگ سے شائع کیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ یہ فیصلہ بھی اہمیت و وقعت کے پیش نظر کرنا ہوگا۔

علاوہ ازیں اشاریہ کو مرتب کرنے کے لئے بطور خاص الف بائی ترتیب کا سہارا لیا جائے۔ اس سے اشاریہ سازی کی ترتیب میں اور دوسروں کو استفادہ کے لئے مدد ملتی ہے اور دوسرا ممکن طریقہ یہ ہے کہ مواد یا معلومات کو الگ الگ عنوانات میں تقسیم کر دیا جائے جیسے شخصیات اور مقامات اور موضوعات وغیرہ ان طریقوں کو ملحوظ رکھیں تو اشاریہ سازی میں ضرور مدد ملتی ہے۔

اشاریہ سازی کی قسمیں:

بنیادی طور پر اشاریہ کی دو قسمیں قرار پاتی ہیں۔ 1) خصوصی اشاریہ 2) نسبتی اشاریہ۔

1) خصوصی اشاریہ Specific Index :

اس طرح کے اشاریہ میں جو کوئی بھی عنوان قائم کیا جاتا ہے اس کے لئے ایک ہی جگہ ہوتی ہے جبکہ اس کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ خصوصی اشاریہ میں چند امور کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے جو درج ذیل ہیں:

- ایک جگہ والی درجہ بندیوں کے لئے یہ نہایت سود مند ہوتا ہے۔
- اس میں محقق کے لئے الجھن کم ہو جاتی ہے۔
- ہر قاری کے لئے اسے شائع کیا جا سکتا ہے اور اس میں متعلقہ سارے عنوانات حروف تہجی کے مطابق الگ الگ ہوتے ہیں۔

2) نسبتی اشاریہ Relative Index :

اس طرح کے اشاریہ میں ہر عنوان کے لئے الگ الگ پہلو نمایاں کئے جاتے ہیں۔ اس قسم کے اشاریہ کی درج ذیل خصوصیات ہوتی ہیں۔

- اس میں وضاحت زیادہ ہوتی ہے اس لئے کہ ہر عنوان کے مختلف پہلو اس میں واضح ہوتے ہیں۔
- اس طرح کے اشاریہ میں ہر عنوان کا متبادل بھی ظاہر ہوتا ہے۔
- مختلف کتب خانوں کی درجہ بندیوں کو یہ ایک عنوان کے تحت استعمال کی رہنمائی کرتا ہے۔

مگر نسبتی اشاریہ میں نقص یہ ہوتا ہے کہ اس میں چوں کہ ہر عنوان کے الگ الگ پہلو واضح ہوتے ہیں جس کی وجہ سے کسی خاص عنوان کی تعین مشکل ہو جاتی ہے اور کسی عنوان کے جو پہلو موجود نہیں ہوتے ہیں تو ان کے لئے جگہ کی تعین بھی کٹھن ہو جاتا ہے اور اس طرح کے اشاریہ میں ضخامت زیادہ ہونے کی وجہ سے ہر قاری کے لئے اس کو شائع کرنا مشکل اور گراں ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں اشاریہ سازی کی دیگر اقسام بھی ہوتی ہیں۔ جیسے :

1) اشاریہ سازی خدمت 2) اشاریہ ماخذ 3) اشاریہ سطرِ اول 4) تجزیاتی اشاریہ 5) موضوعاتی اشاریہ 6) مشینی اشاریہ 7) اضافی اشاریہ 8) کتابی اشاریہ 9) وضاحتی اشاریہ 10) بیانیہ اشاریہ۔

ان ساری قسموں کا مقصد یہی ہے کہ ایک محقق کو کم سے کم وقت میں ایک موضوع سے متعلق اہم اور سارا مواد بیک جا حاصل ہو جائے البتہ بنیادی طور پر تین طریقے لائبریریوں اور کتب خانوں میں رائج ہوتے ہیں جو حسبِ ذیل ہیں :

1) عددی یا تاریخ وار ترتیب
2) حروف تہجی یا جنس وار ترتیب
3) موضوعاتی لحاظ سے ترتیب

ایک اور طریقہ بھی ہوتا ہے جسے شمارہ وار اشاریہ کہا جا سکتا ہے کہ جس میں ہر شمارہ کے زمانے کے اعتبار سے اندراج ہوتا ہے۔ اس میں الف بائی ترتیب اختیار نہیں کی جاتی البتہ شمارہ کا زمانہ، نمبر تخلیقات، تخلیق کار کا نام اور صفحہ نمبر درج کیا جاتا ہے جس سے محقق کی وہاں تک رسائی ہو جاتی ہے اور اسے موضوع سے متعلق مواد کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

اشاریہ سازی اور رسائل و جرائد :

مذکورہ بالا تمام اصول اور نزاکتوں کی بنا پر اشاریہ سازی آج ایک مکمل فن کہلاتا ہے۔ تحقیق میں کتابیات کی طرح اشاریہ سازی کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ عموماً اشاریہ سازی کے فن کو صرف رسائل و جرائد کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے

مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا دائرہ اور بھی وسیع ہے جس کی وجہ سے اہلِ علم، مصنفین اور محققین کو ان کے اپنے تحقیقی اور علمی اور ادبی کاموں میں سہولتیں فراہم ہوتی ہیں۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے محققین کے اہم اہم مضامین، تخلیقات ، نگارشات اور تحقیقات الگ الگ رسالوں اور جریدوں میں بکھرے ہوتے ہیں اسی لئے قاری یا محقق کی ہر رسالہ اور جریدہ تک رسائی نہیں ہو پاتی اور اسے معلوم نہیں ہوتا ہے کہ کس مصنف یا قلم کار کا کونسا مضمون کس رسالہ میں یا کس اخبار اور جریدہ میں یا نمبر اور کتاب وغیرہ میں شائع ہوا ہے۔ تحقیق کی دنیا میں مواد فراہم ہونے کے لئے ایک بڑا اہم ذریعہ کتابیں ہوتی ہیں اور کتابوں کے ساتھ رسائل و جرائد بھی ہوتے ہیں پھر ان میں بھی ایک خاص بات یہ ہوتی ہے کہ کتابیں تو عام طور پر کسی ایک ہی موضوع پر ملتی ہیں یا اکثر و بیشتر ایک موضوع پر مشتمل ہوتی ہیں مگر رسائل و جرائد کا معاملہ دیگر ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ مختلف النوع مضامین کے حامل ہوتے ہیں اور الگ الگ موضوعات پر مشتمل مضامین ان میں شائع ہوتے ہیں۔ کوئی مضمون کسی عظیم اور بڑے محقق کا ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس میں اتنی زیادہ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں کہ وہ کبھی کسی ایک کتاب میں بھی نہیں ملتی اس لئے ایسے مضامین بھی بڑے اہم ہوتے ہیں جو اشاریہ سازی کے ذریعہ محقق کے علم میں آجاتے ہیں اس لئے ان سے بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ ایک اور اہم بات یہ ہوتی ہے کہ رسالوں اور جریدوں میں مضامین وقت و حالات کے تقاضوں کے اعتبار سے بھی لکھائے جاتے ہیں جس میں بڑے بڑے ادیب اور محققین شامل ہوتے ہیں جو اشاریہ سازی کے ذریعہ سامنے آجاتے ہیں ورنہ بڑے بڑے ادیبوں اور محققوں کی تحریروں پر گویا پردہ پڑا ہوا ہوتا ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ تحقیقی دشواریوں میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے میں اشاریہ سازی نہایت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔

اشاریہ سازی کے ذریعہ محقق کو آسانیاں فراہم ہوتی ہیں ورنہ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ محقق کو اس طرح مواد فراہم نہ ہو تو تحقیقی کام ادھورا رہ جاتا ہے اور کتنے ہی ایسے ریسرچ اسکالرس ہیں جو اس کرب میں مبتلا ہیں۔ دنیا کی دوسری زبانوں میں تو اشاریہ سازی کا کام کافی آگے بڑھ چکا ہے لیکن اردو میں پھر بھی اس کام کی رفتار مکمل سست نہ سہی لیکن قدرے سست ضرور ہے تاہم جامعات میں اشاریہ سازی کے موضوع پر تحقیقی کام کئے جارہے ہیں البتہ جتنے مقالے تحریر کئے گئے وہ سب شائع نہیں کئے گئے۔ اگر یہ سب شائع ہو جائیں تو اشاریہ سازی کے باب میں اضافہ ہوگا۔

ویسے کہنے کو تو" تحقیق" میں پانچ حروف ہیں مگر اس کی نزاکتیں اور اصول بہت ہیں۔ اسی لئے محقق کو ایک بڑے معرکہ کو سر انجام دینا ہوتا ہے۔ اسے یہ معلوم ہونا ضروری ہوتا ہے کہ اس کی تحقیق سے قبل متعلقہ موضوع پر کیا لکھا

گیا ہے ؟ کس نے لکھا ہے ؟ وہ مقدار و معیار میں کیسا ہے ؟ اس کو ملاحظہ کرنے کے لئے اشاریہ سازی ضروری ہوتی ہے کہ اسے ملاحظہ کیا جائے تو اس کے لئے راہ عمل متعین ہوتی ہے کہ اپنے کام کو کہاں سے شروع کیا جائے اور اس کو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اب تک کام کی نوعیت کیسی رہی ہے ؟ کمی کیا ہے ؟ اضافہ کیا کیا جا سکتا ہے ؟ بلاشبہ کتابوں کی اہمیت تو مسلم ہوتی ہے اور عموماً بڑے بڑے ادیبوں کی کتابیں مشہور ہو ہی جاتی ہیں مگر اصل مسئلہ رسائل اور جرائد کا ہوتا ہے جن میں بیش قیمت اور گراں قدر مضامین بکھرے پڑے ہوتے ہیں اور یہ بات ظاہر ہے کہ رسالے یا جریدے اپنے زمانہ اور عہد کے عکاس اور ترجمان ہوتے ہیں۔ علم و ادب کی اہم بحثیں ان میں ہوتی ہیں اور پیش آمدہ مسائل و تحریکات پر ان میں اہم مواد شامل ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان میں تاریخ، معاشرت، معیشت، تہذیب، تمدن، ثقافت اور مذہب کے ساتھ ساتھ تمام شعبہٰ ہائے زندگی سے متعلق مضامین پائے جاتے ہیں اور گوناگوں مضامین ہوتے ہیں اور یہ شرف صرف رسالوں ہی کو خاص طور پر حاصل ہوتا ہے کہ مختلف النوع مضامین ان میں اشاعت پذیر ہوتے ہیں۔

اگر رسالوں یا جریدوں کی اشاریہ سازی کی جائے تو گویا وہ مضامین ہاتھ آجاتے ہیں جن کا ملنا بظاہر ناممکن ہوتا ہے۔ اس طرح محقق کے ہاتھ علم و ادب کا نہایت قیمتی ذخیرہ لگ جاتا ہے جس سے اس کا کام جلد از جلد آگے بڑھ جاتا ہے اور الجھنیں اور دشواریاں ختم ہو جاتی ہیں اور آسانیاں فراہم ہوتی ہیں۔

دراصل کسی قوم کی ترقی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے افراد میں تحقیق کا ذوق کس قدر ہے ؟ اور یہ کہ تحقیقی کاموں کی رفتار کیا ہے ؟ اسی جذبے کے تحت قومیں ترقی کرتی ہیں۔ مگر اس کے ساتھ یہ بات بھی اہم ہے کہ تحقیق نہایت دشوار عمل ہوتا ہے۔ محقق کو اپنے تحقیقی کام کے لئے کافی محنت اور ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ مختلف کتب خانوں کی خاک چھاننی پڑتی ہے اور متعدد رسالوں اور جریدوں کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے۔ اس میں جہاں روپیہ پیسہ خرچ ہوتا ہے وہیں کافی ذہنی توانائی بھی صرف کرنی پڑتی ہے۔ ایسی مختلف مصیبتوں اور دشواریوں سے بچنے کے لئے ہی اشاریہ سازی کا عمل شروع کیا گیا ہے جس میں بیک وقت بیک جا بلکہ بیک نظر محقق کے سامنے اہم مواد آجاتا ہے۔ یہ اشاریہ محقق کو اہم معلومات فراہم کرتا ہے اور کام کرنے والا چاہے کوئی ہو اس کے لئے رہنمائی درکار ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اشاریہ سازی کے موضوع پر تحقیقی کام ہو رہے ہیں۔ جامعات میں اساتذہ و طلبہ اس کے لئے فکر مند ہیں اور اردو میں تاخیر سے سہی اس موضوع پر خاصا کام ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی کتاب کے بارے میں بلقیس بیگم (مرتبہ اشاریہ روحِ ادب) نے اس طرح اظہار خیال کیا ہے :

"اس سلسلے کی پہلی کتاب J.D.Pearson کی کتاب Index Islamics ہے۔ اردو میں سب سے پہلے اشاریہ سازی کی طرف کس نے توجہ دی یہ کہنا ذرا مشکل ہے۔ اگرچہ اردو میں اشاریہ سازی کی عمر زیادہ نہیں ہے پھر اس پر مستقل کام اب تک نہیں ہوا ہے۔ البتہ پاکستان میں نیشنل بک سنٹر اور مقتدرہ قومی زبان نے کافی کام کیا ہے۔ مذکورہ اداروں نے اردو ادب، تاریخ، اسلامیات، سائنس اور انجینرنگ کے مختلف موضوعات کے الگ الگ اشارئے تیار کئے ہیں"[۲]

یوں تو رسالوں اور جریدوں کی اشاعت کو بعض افراد معمولی سمجھتے ہیں مگر حقیقت میں ان کی اہمیت کا اندازہ وہ افراد لگا سکتے ہیں جن کو تحقیقی کام کا صحیح اندازہ ہے اور جن کو اس خاردار وادی سے واسطہ پڑا ہے۔ دراصل رسالوں کے موضوعات میں تنوع ہوتا ہے اور ہر مضمون میں کسی نہ کسی مسئلہ پر بھرپور روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اسی لئے بسا اوقات جتنی معلومات ایک مضمون سے حاصل ہوتی ہیں اتنی معلومات کسی کتاب سے بھی نہیں ملتی اور پھر رسائل کے موضوعات زمانے اور حالات کے نئے نئے تقاضوں کے مطابق ہوتے ہیں ایسی صورت میں رسائل موجود ہوں تو ہزاروں صفحات کی ورق گردانی اور برسہابرس کی محنت سے نجات حاصل ہوسکتی ہے۔ انجمن ترقی اردو اور اردو اکادمی دہلی نے اس خصوص میں پیش رفت کی ہے جس کے نتیجہ میں رسالہ اردو، رسالہ آج کل کا اشاریہ تیار ہوا ہے۔ اور مجیب اشرف ندوی کی نگرانی میں نوائے ادب (بمبئی) کی اشاریہ سازی کا کام بھی کیا گیا ہے۔ صلائے عام، اودھ پنچ، معیارِ ادب، فکر و نظر، معارف اور تحریر کے اشاریوں پر بھی کام کیا گیا ہے۔ اسی طرح شخصیات کے اشاریوں میں غالب، اقبال، پریم چند، اور مولانا آزاد جیسی شخصیات کے فکر و فن سے متعلق وقیع اشارئے بھی تیار کئے گئے ہیں۔ اس موضوع پر پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی خدمات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے خدابخش لائبریری میں موجود و محفوظ رسالوں کی فہرست " ایک اور مشرقی کتاب خانہ" کے نام سے تیار کی ہے اور غالبیات، اقبالیات اور انیس و دبیر کے اشارئے بھی تیار کئے ہیں۔

عصرِ حاضر میں چوں کہ سائنس اور ٹکنالوجی نے کافی ترقی کرلی ہے اور یہ ترقیات کا دائرہ بڑھتا ہی جارہا ہے، اس سے بھی علمی و ادبی ذخیرہ میں اضافہ ہوا ہے چنانچہ مختلف اہم اور بڑی لائبریریوں میں کتابوں کو محفوظ کرنے کا عمل جاری و ساری ہے جس کی وجہ سے کتابیں ضائع ہونے سے بچ جاتی ہیں۔

اسی طرح مختلف ویب سائٹس نے بھی کتابوں کو محفوظ کر رکھا ہے جس میں قابلِ قدر علمی و ادبی موجود ہے اور کتابیں، رسالے وغیرہ مطالعہ کے لئے ان میں موجود ہیں جن میں مختلف موضوعات یا شخصیات اور رسائل وغیرہ پر اشاریے

بھی ملتے ہیں۔ عصر حاضر میں یوں تو بیسوں ویب سائٹس ہیں لیکن زیادہ استفادہ " ریختہ " سے کیا جارہا ہے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ریختہ پر موجود اشاریوں کی ایک مختصر فہرست پیش کی جائے تاکہ اشاریہ سے متعلق کام کا اندازہ ہو۔

۱) اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ ۲) اشاریہ آج کل ۳) اشاریہ اردو ۴) اشاریہ اقبالیات ۵) اشاریہ روح ادب ۶) اشاریہ سر سید ۷) اشاریہ غالب ۸) اشاریہ کلام اقبال (کلیات فارسی) ۹) اشاریہ کلام اقبال (اردو) ۱۰) اشاریہ کلام غالب (کلام غالب میں فارسی ترکیبیں) ۱۱) اشاریہ کلام فیض ۱۲) اشاریہ ماہنامہ تحریک دہلی ۱۳) اشاریہ ماہنامہ معارف ۱۴) اشاریہ معارف (جولائی 1961ء تا جون 2005) ۱۵) اشاریہ مکاتیبِ اقبال ۱۶) انجمن ترقی اردو کی خدمات (فہرست) ۱۷) برہان کا اشاریہ ۱۸) توضیحی اشاریہ غالب نامہ ۱۹) اشاریہ جامعہ نئی دہلی ۲۰) اشاریہ کلیات اقبال ۲۱) رسالہ شاہراہ تجزیاتی مطالعہ اور اشاریہ ۲۲) پروفیسر عبدالقادر دسنوی کی مطبوعات کا اشاریہ ۲۳) صدق کا توضیحی اشاریہ۔

جیسا کہ اس مختصر سی فہرست سے ظاہر ہے کہ اس میں رسالوں کے اشارئے بھی ہیں اور اسی طرح مختلف شخصیات پر بھی تیار کئے گئے اشارئے ہیں جو ادب کے قابل قدر سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ سارے اشارئے یقیناً محققین کی محنت کے گواہ ہیں۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے درست نظر آتی ہے کہ :

> " آلاتِ تحقیق میں خاصا تنوع ہے مگر کتابیات اور اشاریہ بلحاظِ اہمیت دیگر "آلات" پر اس بنا پر فوقیت رکھتے ہیں کہ بڑی حد تک تحقیق کی اساس کتابیات پر استوار ہوتی ہے جبکہ اشاریہ میں درج شخصیات، کتب اور مقامات کے حوالوں کے لئے کلید کا کردار ادا کرتا ہے اگرچہ تحقیق، اس کی اہمیت اور حدود و امکانات سے ناواقف حضرات کتابیات اور اشاریہ سازی کو طنزاً قینچی اور گوند کا کام بلکہ کارنامہ قرار دیتے ہیں لیکن اہل تحقیق ان آلات کی ضرورت اور اہمیت سے آگاہ ہیں اسی لئے ہر عہد میں ایسے محنتی بلکہ مشقی حضرات مل جاتے ہیں جو اس نوع کے کاموں ہی میں مسرت حاصل کرتے ہیں"۔[۷]

اس اقتباس سے بھی یہ بات ظاہر ہے کہ ہر دور میں قابل، باصلاحیت اور محنتی اہل علم نے نہ صرف علمی کاموں کی طرف توجہ کی ہے بلکہ اشارئے کے مراحل کو بھی آسان کرنے کی بساط بھر کوشش کی ہے اور یہ کام عصرِ حاضر میں اور بھی ضروری ہو چکا ہے اور آسان سے آسان تر کرنے کا متقاضی ہے اس لئے کہ جدید وسائل و ذرائع بڑھ چکے ہیں اور انٹرنیٹ

وغیرہ عصری سہولتیں بآسانی میسر آرہی ہیں جن سے محققین کا وقت اور بھی زیادہ بچ سکتا ہے۔اس سلسلہ میں ڈاکٹر ظہور الدین احمد کے خیالات صداقت پر مبنی نظر آتے ہیں کہ :

"آج کل کے تیز رفتار زمانے میں ہر کام کو تیزی سے سرانجام دینے کا رجحان ہر جگہ کار فرما ہے۔ہاتھ سے لکھنے کے بجائے مشین سے کام لیا جاتا ہے۔کسی دستاویز کو نقل کرنے کی بجائے فوٹو اسٹیٹ مشین سے نقل بنوا کر رکھی جاتی ہے۔رُسل ورسائل کی بجائے جو بیرونی ممالک میں تاخیر سے پہنچتے ہیں اب ٹیلیکس اور فیکس کے توسط سے فوری پہنچائے جاتے ہیں اسی طرح محققین کے لئے کسی ضخیم مجموعہ کلام سے شعر تلاش کرنے میں کافی وقت تلف ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اس لئے وقت بچانے کے لئے اشاریے کا سہارا لیا جاتا ہے۔کم سے کم وقت میں اصل شعر تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔آج کل علمی و تحقیقی کتابوں کے آخر میں انڈیکس (اشاریہ) کا ہونا لازمی ہو گیا ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر کتاب مطبوعاتی اعتبار سے ناقص شمار ہوتی ہے"۔[۸]

جیسا کہ ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے یقیناً عصر حاضر میں سہولتیں بڑھ گئی ہیں۔نہ صرف فوٹو اسٹیٹ مشین، فیکس، فون بلکہ انٹرنیٹ اور ویب سائٹس نے تو اس معرکہ کو سر کرنے کی تقریباً کامیاب کوششیں کی ہیں اور ای میل نے بھی آسانیاں فراہم کر دی ہیں۔اسی لئے یکے بعد دیگرے علمی و تحقیقی کام اور مختلف تیار کئے گئے اشاریے آج باآسانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔یقیناً یہ عصر حاضر میں علم و تحقیق کی ایک انقلابی صورتِ حال ہے اور یہ اشاریہ کی دنیا میں ایک اہم اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

اشاریہ کے بارے میں یقیناً یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ نہ صرف محققین نے نثر نگاری بلکہ شاعروں کی طرف بھی توجہ مبذول کی ہے اور اردو کے مشہور و معروف شعراء کے کلام کے اشاریے بھی تیار کئے ہیں۔اور اس میں شک نہیں کہ شاعری کا معاملہ نثر کے مقابلہ میں اور بھی زیادہ نازک ہوتا ہے اور زیادہ محنت طلب کام ہوتا ہے اس لئے کہ غزل، نظم اور قصیدہ وغیرہ ہر صنفِ سخن کا تعین یا ان کے مصرعے اور اشعار کے اعتبار سے یہ تیار کرنے ہوتے ہیں۔اس بارے میں یاسمین رفیق نے مختصر طور پر نشاندہی کی اور کلامِ اقبال کے اشاریہ کے حوالہ سے اس کے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے یوں لکھا ہے:

"ڈاکٹر شبلی صاحب نے صرف غلام علی ایڈیشن (۱۹۷۳ء و مابعد) کے حوالہ سے اشاریہ مرتب کیا ہے۔ مزید برآں انہوں نے ہر مصرع کو نہیں بلکہ شعر کے صرف پہلے مصرع کو حوالہ بنایا ہے اس لئے اس کی افادیت محدود ہے۔

داؤد عسکری صاحب کا اشاریہ نسبتاً جامع ہے۔ اس میں ہر شعر کے دونوں مصرعوں کو حوالہ بنایا گیا ہے۔ نیز کلامِ اقبال کی قدیم اشاعتوں (ماقبل ۱۹۷۳) اور شیخ غلام علی ایڈیشن (۱۹۷۳ء و مابعد) دونوں کے صفحات نمبر دے دئے ہیں۔ اس کے بعد بھی مختلف ناشرین کی طرف سے کلیاتِ اقبال (اردو) کے متعدد نسخے شائع ہوئے ہیں۔ ان سب میں اہم نسخہ اقبال اکادمی پاکستان کا ہے۔ اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں"۔۹

اسی طرح اشاریہ کے سلسلہ میں نہ صرف نثر بلکہ شاعری پر بھی محققین نے توجہ کی ہے اور اردو کے مشہور شعراء جیسے غالب، اقبال اور فیض وغیرہ کے کلام کے اشارئے تیار کئے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ مرزا غالب کے کلام میں استعمال شدہ فارسی تراکیب تک کے اشارئے تیار کئے گئے ہیں اور خاصے معیاری تحقیقی کام انجام دئے گئے ہیں جو انتہائی دقت طلب اور محنت طلب تھے۔ اس نوع کے اشاریہ کے طریقہ کار پر روشنی ڈالتے ہوئے رشید حسین خان صاحب (جو لسانیات کے مشہور محقق ہیں) نے یوں لکھا ہے:

"طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے اصل ترکیب کو درج کیا گیا ہے پھر وہ مصرع لکھا گیا ہے جس سے وہ ترکیب ماخوذ ہے۔ اس کے آگے صفحہ نمبر درج کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اس اشاریہ کی مدد سے کلام غالب کا ایک اہم پہلو سامنے آسکے گا جس کی طرف ابھی تک بہت کم التفات کیا گیا ہے اور اس سے ان کے اندازِ فکر اور اسلوبِ بیان کو سمجھنے میں بھی مدد ملے گی"۔۱۰

اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ نثر اور شاعری پر دو کے اشارئے تاحال تیار کئے گئے اگرچہ یہ کام مقدار کے اعتبار سے کم ہے مگر معیار کے اعتبار سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں زیادہ تر تحقیقی اور معیاری کام انجام دئے گئے اور ان سارے اشاریوں کا مقصد قاری یا محقق کے سامنے کتاب یا کتابوں اور مضامین یا متعلقہ مواد کی پوری اور ضروری معلومات فراہم کرنا ہے اور یہ آج کے ہمارے مصروف ترین دور کا تقاضہ بھی ہے اس لئے مغربی ادبیات کی دنیا میں آج کل ان شعراء واد باء اور محققین کے کلام اور تخلیقات و نگارشات نیز تحقیقات کے اشارئے تیار ہو رہے ہیں جو زیادہ مشہور و معروف ہیں۔

خود اردو زبان میں بھی مشہور و معروف ادبی و علمی شخصیات پر بھی خاصا کام ہوا اور ہو رہا ہے جو جو نہایت قابل قدر اور خوش آئند بات ہے۔

سطورِ بالا میں اشاریہ کی جو تعریف و تاریخ پیش کی گئی ہے اور اس باب میں اس کے علاوہ اشاریہ سازی کا فن، اقسام ، خصوصیات، آغاز وارتقاء، اردو میں اشاریہ سازی کا آغاز اور مقاصد و فوائد، اشاریہ سازی کے اہم نکات، اشاریہ کے مختلف طریقے اور رسالوں کے اشارئے اور ان کی اہمیت و افادیت ، اشاریہ سازی پر مشتمل تحقیقی کام ، جامعات ، ادارے اور انجمنوں نیز شخصیات کی نشاندہی اور ان کی خدمات کا تفصیلی طور پر ذکر کیا گیا اور اشاریہ سازی کے بارے میں اہم باتوں کو یہاں پیش کیا گیا۔

اشاریہ سازی سے متعلق ان ساری اہم اور ضروری باتوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اشاریہ سازی اب ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ علمی و ادبی کاموں کے لئے محققین کے لئے یہ اتنے ہی ضروری ہو گئے ہیں جتنی انسان کو تازہ ہوا اور صاف پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اشاریہ سازی کے اصول و آداب بھی متعین کر دئے گئے ہیں جن کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ یہ کام یقیناً محنت طلب اور دقت آشنا ہے جس میں محققین کو نہایت صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور عرق ریزی کرنی پڑتی ہے اور اپنے آپ کو جوکھم میں ڈالنا ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی کے مقابلہ میں اشاریہ سازی کا کام کم ہوا ہے تاہم جو کچھ بھی ملتا ہے وہ نہایت وقیع، اہم اور قابل قدر ہے جس کی وجہ سے علم و ادب کے سرمایہ میں بجا طور پر اضافہ ہوا ہے۔

حوالہ جات

1)فیروز اللغات، صفحہ نمبر ۹۶۔

2) اردو انسائیکلوپیڈیا ویب سائٹ۔

3) اشاریہ دل گداز۔ محمد قمر سلیم، صفحہ نمبر ۱۶ ۔۲۰۰۳ء ۔

4) https:en.oxforddictionaries.com

5) www.dictionary.com>brows

6) اشاریہ روح ادب۔ بلقیس بیگم، صفحہ نمبر ۶ ۔دی گلوزی آرٹ پریس۔ کلکتہ۔ ۲۰۰۴ء۔

7) اشاریہ سر سید۔ عاندہ قریشی، صفحہ نمبر ۱۰ ۔دیباچہ۔ عاکف بک ڈپو، نئی دہلی۔ ۲۰۰۳ء۔

8) اشاریہ کلامِ اقبال فارسی۔ زبیدہ بیگم، صفحہ نمبر ۶۔ ابتدائیہ۔ بزم اقبال لاہور۔ مئی ۱۹۹۶ء۔

9) اشاریہ کلام اقبال اردو۔ یاسمین رفیق، صفحہ نمبر ۷۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور۔ ۲۰۰۱ء۔

10) اشاریہ کلام غالبؔ۔ صفحہ نمبر ۸ ۔شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی۔ ۱۹۷۰ء۔

☆☆☆

باب چہارم

فن ترجمہ سے متعلق مضامین کا توضیحی اشاریہ

مضمون کا عنوان: **ترجمے کے غور طلب امور اور مسائل**	
مضمون نگار: **نبلیٰ پیرزادہ**	رسالہ کا نام: اخبار اردو
صفحہ نمبر: 3-2	جلد نمبر: 34 شمارہ نمبر: 11,12
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: نومبر، دسمبر 2012
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: ورڈ میٹ پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر: ایگزیکیٹو ڈائریکٹر (معتمد)، ادارہ فروغ قومی زبان (مقتدرہ قومی زبان) ایچ ۸/۴، اسلام آباد	ایڈیٹر: سید سردار احمد پیرزادہ

اس مضمون میں پاکستان میں اردو کے بطور سرکاری زبان نفاذ کے حوالے ترجمے کے غور طلب امور اور مسائل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنفہ نے مضمون کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ کا عنوان 'پس منظر' اور دوسرے کا' اردو کو بطور سرکاری زبان اختیار کرنے کے حوالے سے ترجمہ کے ضروری امور، مسائل ' ہے۔ پہلے حصہ میں پاکستان میں اردو کے بطور سرکاری زبان، نفاذ کا پس منظر بتایا گیا ہے۔ اس میں قیام پاکستان سے قبل اور اس کے بعد محمد علی جناح کے اردو کو سرکاری زبان بنانے کے اعلانات سے لے کر 1973 میں اس کے لیے کی گئی قانون سازی کا ذکر ہے۔

مضمون نگار کے مطابق گو کہ 1973 میں اردو کے بطور سرکاری زبان نفاذ کے لیے 15 سال کی مدت مقرر کی گئی تھی، تاہم 1988 میں یہ مدت پوری ہونے کے بعد بھی آئین کے اس فیصلہ کا نفاذ نہ ہو سکا۔ بعد میں چیف جسٹس آف پاکستان جواد ایس خواجہ نے 9/ ستمبر 2015 اس کا اعلان کیا جس کے تحت تمام تر وزارتوں، اداروں اور محکموں میں اردو کو آئندہ بطور سرکاری زبان اپنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ مضمون کے مطابق پاکستان میں صرف 8 فیصد لوگوں کی مادری زبان اردو ہے تاہم اسے پاکستان کی واحد لنگوافرانکا کا درجہ حاصل ہے۔ مضمون میں ہندوستان میں سرکاری زبان کے نفاذ کی تاریخ اور اس کی مشکلات اور موجودہ صورتحال کا بھی سرسری تذکرہ ہے۔ مضمون میں کہا گیا کہ دنیا کے دیگر ممالک اور پڑوسی ملک (ہندوستان) کے

اس لسانی تناظر میں پاکستانی سپریم کورٹ کی جانب سے ملک میں اردو کو سرکاری زبان قرار دیے جانے کا فیصلہ یقیناً ایک بہت بڑا فیصلہ تھا جس پر عملدرآمد کے لیے محنت اور لگن درکار ہو گی۔

مضمون کے دوسرے حصہ " اردو کو بطور سرکاری زبان اختیار کرنے کے حوالے سے ترجمہ کے ضروری امور، مسائل " میں ترجمہ کی تعریف، اس کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے پاکستان میں ترجمہ سے متعلق ادارے کے قیام پر زور دیتے ہوئے کہا گیا کہ جن ممالک میں ملکی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے وہاں پہلے ترجمہ کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے اور بڑے بڑے "ترجمہ گھر" یا" ٹرانسلیشن ہاؤسز" کی بنیاد رکھی گئی۔ مضمون کے مطابق فی الوقت پاکستان میں ایسا کوئی ادارہ موجود نہیں ہے البتہ دیگر کئی اداروں جیسے انجمن ترقی اردو، اردو لغت بورڈ، اردو سائنس بورڈ، شعبہ تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی اور ادارہ فروغ قومی زبان (مقتدرہ قومی زبان) نے اردو میں سرکاری مراسلت اصطلاحات لغات اور دیگر حوالوں سے بہت سے بنیادی کام کر رکھا ہے اس سے اردو میں ترجمہ کرنے میں معاونت حاصل ہو گی۔

مضمون میں اردو ترجمے کے دوران پیش آنے والے بارہ بنیادی امور پر روشنی ڈالی گئی ہے جس میں انگریزی اور اردو زبانوں پر مترجم کو مکمل دسترس حاصل ہونے، مغربی زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرتے وقت جملے کی ساخت کو ملحوظ رکھنے، مترجم کو ادبی زبان کے تہذیبی اور علاقائی پس منظر سے واقف ہونے اور سرکاری تراجم کی انجام دہی کے وقت متعلقہ ادارے کی نوعیت اور ذمہ داریوں سے واقف ہونے، سرکاری قوانین قوائد و ضوابط اور دیگر دستاویزات کے ساتھ ساتھ سائنسی اور تکنیکی دستاویزات نے اصطلاحات کے ترجمے میں یکسانیت، معروف انگریزی الفاظ کو اردو میں جوں کا توں لینے، فنی اصطلاحات کے ترجمے کے دوران اختصار اور مفہوم کو پیش نظر رکھنے، ترجمے کے دوران تذکیر وتانیث کے بنیادی اصولوں سے مترجم کے آگاہ رہنے، اصطلاحات کے ترجموں کا واضح ہونے، عربی یا فارسی کی مشکل اصطلاحات کے بجائے مقامی زبان کا لحاظ رکھ کر اصطلاح سازی کرنے، مترجمین کو اسمائے معرفہ کی تحقیق کرنے، سرکاری دستاویزات کے ترجمے میں قواعد و ضوابط کا خیال رکھتے ہوئے ہندسوں اور انگریزی حروف تہجی کو تحریر کرنے اور ترجمے کے ان مسائل کے علاوہ کمپوزنگ کے عمل کے دوران لے آؤٹ، سرخیوں اور فونٹ سائز کو بحال رکھنے پر زور دیا گیا ہے۔ اردو کو سرکاری زبان بنانے کے لیے تراجم کی ضرورت اور ذمہ داری کے تئیں بنیادی نقطہ نگاہ میں مثبت تبدیلی لانے اور معتدل رویہ اپنانے کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا ہے۔

یہ مضمون ائیر یونیورسٹی اسلام آباد میں "زبان کی پالیسی " کے حوالے سے منعقدہ سیمینار میں پڑھا گیا۔

مضمون میں جابجا مثالیں بھی دی گئی ہیں تاہم مضمون میں بیان کردہ مسائل کوئی نئے نہیں ہیں۔ ان پر ایک عرصہ سے مباحث جاری ہیں۔ اس کے علاوہ مضمون میں حوالے بھی دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ مضمون میں انگریزی سے مغلوب ہو جانے والوں اور ہر لفظ کو اردو میں منتقل کر دینے کی سفارش کرنے والوں کو اعتدال اور میانہ روی سے کام لینے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ جہاں انگریزی والوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ انگریزی سے مرعوب نہ ہوں وہیں اردو والوں کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ انگریزی کی بین الاقوامی حیثیت کا خیال رکھیں۔

مضمون کا عنوان: **ترجمہ کے چند نظری مباحث**	
مضمون نگار: **ڈاکٹر مشتاق احمد قادری**	رسالہ کا نام: اردو ریسرچ جرنل
صفحہ نمبر:22-11	جلد نمبر: شمارہ نمبر: 13
دورانیہ: سہ ماہی	سنہ اشاعت: جنوری تا مارچ 2018
مقام اشاعت: نئی دہلی	مطبع:
ناشر:	ایڈیٹر: ڈاکٹر عزیز اسرائیل

اس مضمون میں انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقا میں ترجمے کے کردار کا جائزہ لیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ایک انسانی گروہ میں رائج تصورات مشاہدات تجربات کے فکری سرچشموں تک رسائی اور ہر زبان کے لٹریچر میں موجود اس قبیلے کی تاریخ تہذیب اور ذخیرے علم کے سوتو تک رسائی حاصل کرنے میں ترجمے نے اہم کردار ادا کیا ہے تاہم جہاں تک اردو کا معاملہ ہے تو اس بات پر افسوس کا اظہار کیا گیا ہے کہ اردو کے مخصوص ادیبوں کو چھوڑ کر زیادہ تر نے ترجمے کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے باوجود اس پر باضابطہ کام کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اس سلسلے میں پروفیسر قمر رئیس کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔

مضمون نگار کے مطابق اردو زبان و ادب کی ترقی میں سب سے اہم رول ترجمہ کا ہی رہا ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں آمد کے بعد ہماری تہذیب کو ملیامیٹ کرنے سے قبل ہماری ادبی شناخت ہمارے تمدنی میعار کو پرکھا اور پھر اس کی جڑوں کو کھودنا شروع کیا لیکن مضمون نگار یہ بھی کہتے ہیں کہ انگریزوں نے اردو زبان کی ترقی میں کافی اہم رول ادا کیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اردو کی خدمت کی۔

مضمون نگار کے بقول انگریزوں کے عہد میں ہی اردو زبان فکری اعتبار سے توانا ہوئی اور اس کی بڑی وجہ یوروپی زبانوں کے ادب سے اردو میں ہونے والے تراجم تھے جس سے اردو مالامال ہوتی چلی گئی۔ اس کے بعد مضمون نگار نے پروفیسر محمد حسن کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ترجمہ صرف متبادل الفاظ کا ایک سلسلہ ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بہت آگے کی چیز ہے۔ مضمون نگار کے بقول ترجمہ ایک ایسا فن ہے جس میں کچھ ناقابل کنٹرول قسم کی خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔

ہمیں اصل زبان پر بھی ایسا ہی ثبوت درکار ہے جیسا اپنی مادری زبان پر حاصل ہوتا ہے اور یہ کہ ترجمہ کرتے وقت کاٹ چھاٹ دیانتداری کے خلاف ہے تاہم اس میں مشکل یہ ہے کہ کسی بھی زبان کے شہ پارے کو دوسری زبان میں من و عن بیان کرنا ایک نہایت مشکل امر ہے جس کے لئے مترجمین کا دونوں زبانوں کے کلچر سے واقف ہونا ضروری ہے۔ پھر مضمون نگار نے مصنف اور مترجمین کے درمیان حائل زمانی فرق کا بھی ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اسے پاٹنا بھی مترجم کے لیے ایک مشکل کام ہے۔

پھر مضمون نگار نے ترجمے کی چند عمومی مسائل کا تذکرہ کیا جو مترجمین کو دوران ترجمہ لاحق ہوتی ہیں جیسے مذہبی ترجمے کے دوران مذہب و مسلک کے بنیادی عناصر کو سمجھنا محاورات کے مسائل اور ضرب الامثال، اصل زبان کے ہدفی زبان میں مترادفات یہ متبادلات کا دستیاب ہونا، زبان میں فصاحت اور بلاغت کے مختلف معیارات، صنائے بدائے اور تشبیہات کا دونوں زبانوں میں یکساں نہ ہونا وغیرہ وغیرہ تاہم ان تمام کے باوجود مترجمین کا ماننا ہے کہ موجودہ گلوبلائزیشن کے دور میں ترجمے کی اہمیت بڑھتی ہی جارہی ہے۔ مضمون نگار کا کہنا ہے کہ دوران ترجمہ مترجمین اصل زبان کے محاورات تشبیہات اور استعارات کو ہدفی زبان میں داخل کرنے کے لئے نئے نئے اصطلاحات وضع کرتے ہوئے ہدفی زبان کے دامن کو وسیع کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

مترجم کا ماننا ہے کہ اردو میں نثر ہو یا شاعری ان میں در آنے والی تمام اصناف جس کی بنیاد پر اردو ادب قائم ہے وہ ترجمے ہیں جو دوسری زبانوں سے ہماری زبان میں آئے ہیں۔ اس کی ایک مثال مضمون نگار نے غزل کی صورت میں پیش کی کہ غزل فارسی سے ہوتی ہوئی ہمارے پاس آئی لیکن اس نے فارسی سے زیادہ یہاں پذیرائی حاصل کی اور بہت سارے شعرا فارسی میں غزل گوئی کو ترک کرکے اردو میں غزل کہنے لگے جس کی ایک مثال غالب ہیں۔

پھر مضمون نگار نے ترجمے کی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ فن بہت قدیم ہے لیکن اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس کے معیار کے تعین کے لئے کوئی اصول مقرر نہیں کیا گیا جس کی بنا پر تراجم کے ذخیرے میں بہت ساری اچھی چیزوں کے ساتھ کچھ خراب ترجمے بھی شامل ہو گئے چنانچہ مضمون نگار کے مطابق جب تک اس فن کے لئے کوئی احتسابی اصول مقرر نہ کیا جائے تب تک اس کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ نہیں کیا جاسکتا اور یہ کہ ایک خاص عمل کے بعد ترجمے کی

اہمیت کو پس پشت ڈال دیا گیا اور جس کے نتیجے میں زبان میں ہونے والی توسیع میں کمی آگئی اور ہم رفتہ رفتہ کلاسیکی روایت سے دور ہوتے چلے گئے جس کی بنا پر اردو کا دامن ٹھٹھر تا جارہا ہے۔

اس کے بعد ترجمے کے فن کے تقاضوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ مترجمین کو بھی انہیں مراحل سے گزرنا ہوتا ہے جن سے مصنف گزرا ہوتا ہے اس کے لئے زمانی انقلابات پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ مترجم کے لیے یہ بھی شرط ضروری ہے کہ اس کے اندر ایک مصنف پایا جائے چنانچہ ایک قابل مترجم بیک وقت مصنف اور صحافی بھی ہوتا ہے۔

مضمون نگار نے کہا کہ اصل زبان کے الفاظ کے متبادلات کو ہدفی زبان میں رکھ دینا ہی ترجماں نہیں ہے بلکہ مصنف اور متن کی اصل روح تک رسائی حاصل کرنا زیادہ اہم ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کے مضمون نگار مفہوم کی منتقلی کو ترجمہ مانتے ہیں۔ وہ لفظی ترجمہ کے قائل نہیں ہیں اور اسکے لئے انہوں نے زبان میں پیش آنے والے مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

مضمون کے آخر میں دنیا کی تیز رفتار ترقی کا حوالہ دے کر کہا گیا ہے کہ اس میں ہر معاشرے کو برابر طور پر ترقی یافتہ بنانے میں مترجمین کا بہت بڑا رول ہوتا ہے۔ مضمون نگار کے بقول ماہرین ترجمہ بھی اچھے اور برے ہو سکتے ہیں اس لئے چند برے ترجموں کو دیکھ کر ترجمہ سے ہی گریز کر دینا کوئی اچھا خیال نہیں ہے۔ مضمون میں جابجا حوالے اور اقتباسات دیئے گئے ہیں اور ترجمے کے تمام تقاضوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مضمون کا عنوان: **اردو ترجمے کا ارتقاء**	
مضمون نگار: خلیق انجم	رسالہ کا نام: اخبار اردو
صفحہ نمبر:5-2	جلد نمبر: 35 شمارہ نمبر: 1,2
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: جنوری، فروری 2017
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: ورڈ میٹ پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر: ایگزیکیٹو ڈائریکٹر (معتمد)، ادارہ فروغ قومی زبان (مقتدرہ قومی زبان) ایچ ۸/۴، اسلام آباد	ایڈیٹر: سید سردار احمد پیرزادہ

اس مضمون میں مغلوں کے عہد سے اردو ترجمہ کے ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کیونکہ مغلوں کی سرکاری زبان فارسی تھی چنانچہ دیگر زبانوں سے فارسی اور فارسی زبانوں سے دیگر زبانوں میں تراجم ہوتے رہے ہوں گے جس سے مغل بادشاھوں کی ہندوستانی ادب کی طرف بھی توجہ رہی ہو گی۔ مضمون میں اکبر کے دور میں سنسکرت سے فارسی میں ہونے والے تراجم کا تعارف کروایا گیا ہے۔ چنانچہ سنگھاسن بتیسی تاریخ کشمیر لیلاوتی مردمان تعجب ہری بند وغیرہ فارسی میں بے شمار ترجمہ تیار ہوئے جس میں برہمن اور مسلمان عالم دونوں برابر شریک تھے۔اس کے علاوہ ہندوستان کے باہر ہندوستانی کتابوں کے عربی میں ترجمہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کے بعد اردو میں فارسی عربی اور سنسکرت سے ہونے والے ترجموں کا جائزہ لیا گیا ہے یہ ترجمہ مذہب تصوف شاعری داستان وہیئت اور فلسفے کی کتابوں کے تھے مضمون نگار کے مطابق اردو میں پہلے ترجمے کا اندازہ لگانا مشکل ہے اس سلسلے میں انہوں نے بعض محققین کی آراء پیش کی ہیں جس کے مطابق شاہ میراں جی خدانما نے ابوالفضائل عبداللہ بن محمد عین القضا ہمدانی کی تصنیف تمہیدات ہمدانی کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا وہ اردو کا پہلا ترجمہ ہے۔ دوسری تحقیق یہ ہے کہ ملا وجہی نے

پہلی بار شاہ جی نیشاپوری کی فارسی تصنیف دستور عشاق کا اردو میں سب رس کے نام سے ترجمہ کیا۔اس کے علاوہ معرفت و سلوک، طوطی نامہ اور روضتہ الشہدا بھی وہ کتب ہیں جن کا اردو کے پہلے دور میں ترجمہ ہوا۔

مضمون نگار نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ یہ تمام ترجمع باقاعدہ ترجمے نہیں تھے بلکہ کتابوں کی تلخیص یا آزاد ترجمے تھے۔اس کے بعد عیسائیوں کی ہندوستان میں آمد نے مذہبی کتب کے ترجموں کو تیزی عطا کی۔ چنانچہ اس زمانے میں تورات انجیل کتاب دانیال قرآن شریف وغیرہ کے تراجم ہوئے۔اردو میں قرآن شریف کا پہلا ترجمہ مولانا شاہ رفیع الدین نے کیا جو لفظی تھا اس ترجمے میں سلاست اور روانی نہیں تھی یہ ترجمہ ۱۷۷۶ میں کیا گیا جس کے نو سال بعد سے ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر نے بھی قرآن شریف کا اردو میں ترجمہ کیا یہ ترجمہ پہلے ترجمے کے مقابلے میں زیادہ سلیس شگفتہ اور آسانی سے سمجھ میں آنے والا تھا۔اس کے بعد ہندوستان میں ترجموں کے مشہور ادارے جیسے فوٹ ولیم کالج دہلی کالج اور دارالترجمہ عثمانیہ کی خدمات کا ایک جائزہ لیا گیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے تحت بتایا گیا ہے کہ یہ وہ پہلا ادارہ تھا جس نے منظم اور باقاعدہ طریقے پر عربی فارسی اور سنسکرت سے اردو میں ترجمے کیے ورنہ اس سے قبل جتنے بھی تراجم ہوئے وہ انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھے۔

اس کے بعد فورٹ ولیم کالج کے قیام کا پس منظر بتاتے ہوئے کہا گیا کہ ٹیپو سلطان پر انگریزوں کی فتح کے جشن کے طور پر اس کالج کا قیام عمل میں آیا تھا اور اس کالج کا ایک اصل مقصد یہ تھا کہ بنگال مدراس اور بمبئی کی ریاستوں کے جونیئر سیون ملازموں کو ہندوستانی زبانیں سکھائی جائیں تاکہ وہ سرکاری کام بہتر طور سے انجام دے سکیں۔

کالج میں ہندوستانی زبان کا ایک باقاعدہ شعبہ قائم کیا گیا تھا جس کے لیے گلکرسٹ کو پروفیسر کی حیثیت سے مقرر کیا گیا تھا اور چونکہ ہندوستانی زبان پڑھانے کے لیے نصابی کتابیں بالکل نہیں تھی چنانچہ کالج کے نصاب میں شامل کرنے کے لئے 60 کتابیں تیار کی گئی جو کہ تراجم کی بنیاد بنی ان میں پابند ترجمے بھی تھے اور آزاد ترجمے بھی فورٹ ولیم کالج میں اردو ترجمے کا کام انجام دینے والوں میں عبداللہ مسکین کاظم علی جوان، بہادر علی حسینی مظہر علی خان ولا شیر علی افسوس حیدر بخش حیدری خلیل علی خان وغیرہ وغیرہ شامل تھے۔

اس کے بعد مضمون میں دہلی کالج کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا گیا کہ دہلی کالج کو فورٹ ولیم کالج پر فوقیت حاصل ہے ۔اس کے بعد دہلی کالج کے قیام کے پس منظر پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ پورے ملک میں دہلی کالج ہی وہ

واحد کالج تھا جہاں مغربی علوم کی تعلیم اردو کے ذریعے دی جاتی تھی۔ برطانوی حکومت نے اردو نصابی کتب کی تیاری کے لیے یہاں پر ایجوکیشنل کمیٹی قائم کی تھی۔ جس نے کوئی خاص کام انجام نہیں دیا چنانچہ کچھ عرصے بعد دہلی ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی وجود میں آئی۔ اس کے بعد اس سوسائٹی کے نو بڑے مقاصد کو پیش کیا گیا ہے اس کے علاوہ اس سوسائٹی میں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہو آیت کا بھی تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ مضمون نگار نے ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے حوالے سے اس ادارے میں شائع ہونے والے 121 کتب کی فہرست کا بھی ذکر کیا ہے۔

اس کے بعد اردو میں نثری تراجم کے سلسلے میں انجمن ترقی اردو کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ان میں مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے شعبے کے طور پر انجمن ترقی اردو کا وجود ہوا جس کا مقصد زبان اور ادب کی ترقی تھا اس کے پہلے صدر پروفیسر تھامس آرنلڈ اور سیکرٹری علامہ شبلی تھے جس نے خاصی تعداد میں ترجمے کیے اور یہیں سے اصطلاح سازی کے فن پر مولوی سید وحیدالدین سلیم کی وضع اصطلاحات کے نام سے کتاب شائع ہوئی۔

اس کے بعد مضمون میں دارلترجمہ عثمانیہ کا جائزہ لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں اردو کے ذریعے مختلف علوم کی تعلیم کا یہ پہلا تجربہ تھا جو غیر معمولی طور پر کامیاب رہا اور مولوی عبدالحق کی تجویز سر اکبر حیدری اور سر راس مسعود کی کوششوں سے حیدر آباد کے نواب میر عثمان علی خان نے اردو ذریعہ تعلیم کی یونیورسٹی قائم کی جسے 20 اپریل کو جامعہ عثمانیہ کے نام سے منظوری دی گئی اور 14 اگست 1947 ترجمے کے نام سے ترجمہ کیا گیا۔

اس کے لیے ہندوستان کے مختلف حصوں سے ماہرین اور مترجمین کا تقرر کیا گیا اور اس ادارے نے لگ بھگ ساڑھے چار سو کتابیں تیار کیں جن میں 20 تصانیف تھیں اور باقی ترجمہ تھے۔ 329 کتابیں انگریزی سے 17 عربی سے 17 فارسی سے 6 جرمن سے اور 5 فرانسیسی سے اردو میں ترجمہ کی گی۔ آخر میں مضمون نگار نے کہا کہ گو کہ اردو میں تراجم کے معاملے میں دیگر اداروں کا بھی کافی رول ہے تمام اہم مضمون کی طوالت کی بناپر طوالت کے ڈر سے یہاں ان کا ذکر نہیں کیا جاسکتا چنانچہ مضمون نگار نے مشورہ دیا کہ ڈاکٹر مرزا حامد کی کتاب مغرب سے نثری تراجم کا مطالعہ کیا جائے۔ مضمون کے آخر میں ماخذات کی فہرست دی گئی ہے۔

مضمون کا عنوان: **ترجمہ نگاری کا فن**	
مضمون نگار: مناظر عاشق ہرگانوی	رسالہ کا نام: اخبار اردو
صفحہ نمبر:4-3	جلد نمبر: 33 شمارہ نمبر: 1,2
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: جنوری،فروری 2015
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: ورڈ میٹ پرنٹرز،اسلام آباد
ناشر: ایگزیکیٹو ڈائریکٹر (معتمد)،ادارہ فروغ قومی زبان (مقتدرہ قومی زبان) ایچ ۸/۴،اسلام آباد	ایڈیٹر: سید سردار احمد پیرزادہ

مضمون کے شروع میں ترجمے کی تعریف اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے بعد ترجمے کے مسائل کا ذکر کیا گیا ہے۔اس کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی کے حوالے سے تحریری ترجمے کے تین طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جس میں لفظی ترجمہ آزاد ترجمہ اور اور تیسرا ایسا ترجمہ شامل ہے جس میں مصنف کے لہجے کی کھنک اور آہنگ بھی باقی رہے اور اپنی زبان کا مزاج بھی بنیادی طور پر موجود رہے اور ترجمہ اصل متن کے مطابق بھی ہو۔ مضمون نگار کے مطابق یہ ترجمہ سب سے زیادہ مشکل ہے لیکن ایسے ترجموں سے ہی زبان و بیان کے نئے ڈھنگ اور اسلوب سامنے آتے ہیں اور ادبی زبان کو فائدہ پہنچتا ہے اور اس کے سانچے وسیع ہوتے ہیں۔

اس کے بعد مضمون میں ترجمے کے فن سے بحث کی گئی ہے اور جارج اسٹائل کا وہ قول بیان کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ 99 فیصد تراجم ناقص ہوتے ہیں۔اس کے بعد ترجمے کے سیکھنے سکھانے کے ماحول پر گفتگو کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ترجمے میں ایک عنصر ہنر کا بھی ہوتا ہے جو ماہرانہ تربیت سے نکل سکتا ہے لیکن اس کے لئے دہری دہری صلاحیت کی ضرورت پڑتی ہے۔ مضمون نگار کے مطابق اس کے لئے متن کی زبان اور ادبی زبان کے ساتھ ساتھ موضوع سے بھی مناسبت درکار ہے اور مصنف سے بھی کسی نہ کسی قسم کی نفسیاتی مماثلت لازمی ہے اور جس صنف ادب یا شاہ عالم سے متن وابستہ ہے وہ وابستگی بھی مترجم کو حاصل ہونی چاہیے تب شاید ترجمہ امام یار سے بہتر ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد شاعری کے ترجمے کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے اس لیے کہ اس کا ایک جداگانہ لسانی عمل ہے اور ہر طرح کی شاعری اپنا وجود خود رکھتی ہے۔ مضمون نگار کے مطابق اردو میں ہونے والے ترجمہ میں انتقال معانی پر زور دیا جاتا ہے لیکن زیادہ تر ترجمہ اصل سے کوسوں دور ہے اس لیے کہ اس میں بہت زیادہ تحریف اور تغیر کیا گیا ہے اور اس کے علاوہ اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے والے افراد بھی افراط و تفریط کے شکار ہو جاتے ہیں۔اس سلسلے میں غالب کے ایک شعر کی انگریزی میں ترجمے کی مثال دی گئی ہے جس پر حامد کاشمیری کا تبصرہ موجود ہے۔

اس کے بعد مضمون نگار نے 21ویں صدی میں ترسیل و ابلاغ کی ایجادات اور گلوبلائزیشن کو ذہن میں رکھتے ہوئے مشینی ترجمے کی اہمیت پر زور دیا ہے اور اس کی ایک مختصر تاریخ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ابھی مشینی ترجمہ ایک لفظ کے کئی متبادلات میں سے کسی مناسب متبادل کو منتخب کرنے کے قابل نہیں ہیں اس سلسلے میں ایک مثال بھی دی گئی ہے۔آخر میں کہا گیا ہے کہ خیرات الفاظ کی معنونیت فکر کی اکائی اور حذف و اضافہ کا خیال کا عرفان ترجمہ نگار کے لیے لازمی عمل ہیں۔

مضمون کا عنوان: **اردو میں فنی اور سائنسی تراجم**	
مضمون نگار: خادم علی ہاشمی	رسالہ کا نام: اخبار اردو
صفحہ نمبر:5-2	جلد نمبر: 36 شمارہ نمبر: 7
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: جولائی2018
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: ورڈ میٹ پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر: ایگزیکیٹو ڈائریکٹر (معتمد)، ادارہ فروغ قومی زبان (مقتدرہ قومی زبان) ایچ ۸/۴، اسلام آباد	ایڈیٹر: سید سردار احمد پیرزادہ

مضمون کے ابتداء میں ترجمے کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ترجمے ہی کی بدولت کوئی عام زبان اس قابل ہوتی ہے کہ وہ دیگر زبانوں کے شانہ بشانہ ٹھہر سکے اور اگر آج اردو بھی دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے برابر کھڑی ہے تو اس کا سہرا ترجمہ ہی کے سر بندھتا ہے۔اس کے بعد دنیا کی ترقی میں صنعت و حرفت اور سائنس و ٹیکنالوجی کے کردار پر ایک طویل اقتباس دے کر سمجھایا گیا ہے کہ جس طرح غالب اور حکمران اقوام کی تہذیب تمدن مغلوب اقوام کے لئے فیشن کا درجہ اختیار کر لیتی ہے اسی طرح زندہ علوم بھی غالب اقوام کی اجارہ داری میں آجاتے ہیں اور اس طویل اقتباس کے ذریعے ترجمے کی اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سائنسی علوم کے حصول کے لئے مسلمانوں کی یونانی عبرانی سریانی سنسکرت اور چینی زبانوں سے عربی تراجم اور ساتھ ہی یورپی اقوام کی عربی زبان سے لاطینی اور دیگر یورپی زبان میں تراجم کا ذکر کیا گیا۔ کہا گیا کہ بیسویں صدی کے آغاز ہی سے علوم میں ترقی کی رفتار اچانک بڑھ گئی اور ذرائع ابلاغ کی ترقی کی بنا پر مختلف علوم کے جرائد اور رسائل دنیا بھر سے جاری ہونے لگے اور چنانچہ اب مشینی ترجمے کا دور آگیا ہے اور چونکہ اب یورپ کی علوم پر اجارہ داری ٹوٹتی نظر آتی ہے اس لیے امریکہ آسٹریلیا چین جاپان نے بھی سائنسی علوم میں کروٹ لی ہے اور ترقی کے دور میں کسی کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہر ملک کی زبان سیکھے اس لیے اکثر اقوام نے سائنسی معلومات کی خاطر انگریزی زبان ہی کو اپنا لیا جس کی بنا پر نئی اصطلاحات

اتنی تیزی کے ساتھ سامنے آنا شروع ہوئیں کہ ہر اصطلاح کا ترجمہ ناممکن ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ دیگر قوموں نے اصل زبان میں رائج اصطلاحات کو جوں کا توں لینا شروع کیا اور یہ کام پہلی مرتبہ نہیں ہوا بلکہ عربی میں تراجم کے وقت بھی یا عربی سے سائنسی علوم کے تراجم کے وقت بھی ان اصطلاحات کو جوں کا توں لیا گیا۔ اس سلسلے میں مختلف مثالیں بھی دی گئی ہیں۔ اس کے بعد اصطلاح سازی کے متعلق چند سوال کھڑے کئے گئے اور پھر مضمون نگار نے اصطلاح وضع کرنے کے اصول بیان کیے اور اس سلسلے میں نویں صدی عیسوی میں حنین بن اسحاق نے ترجمے کے سلسلے میں جو اصول مرتب کیے انہیں بیان کیا گیا زبان میں بھی اصطلاح سازی کا کام تقریباً انہیں خطوط پر ہوا۔ پھر اس کے بعد اردو میں اصطلاحات سازی کے اصولوں کی جانب توجہ مبذول کی گئی اور وضع اصطلاحات کی تاریخ اور ان اداروں کا ذکر کیا گیا جنہوں نے اصطلاحات کا کام کیا۔ بعد ازاں اردو میں وضع اصطلاحات کے سلسلے میں ہونے والے اصولوں کو درج کیا گیا اور اس کی مثالیں دی گئیں۔

مضمون نگار نے اس بات کی حمایت کی ہے کہ اصطلاحات کا بھی ترجمہ کیا جائے نہ کہ اصطلاحات کو جوں کا توں لیا جائے۔ مضمون نگار کے مطابق دوسری زبان کی اصطلاحات کی بناء پر طلباء فہم وادراک سے محروم رہتے ہیں اور اکتسابی عمل نہیں ہوتا اس کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ہمارے ماحول میں صنعت اور سائنس میں تخلیق و ترقی کے راستے ابھی تک اس لئے نہیں کھلے کہ فنی اور سائنسی اظہار خیال کے لئے ہم غیر ملکی اصطلاحات کا سہارا لیتے ہیں اصطلاحات کے سلسلے میں کی گئی کوششوں کا مضمون نگار نے پھر ایک مرتبہ ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں مضمون نگار نے اصطلاحات کے سلسلے میں اصطلاحات کا ترجمہ کرنے والی کتابوں کا تعارف کروایا ہے۔

مضمون نگار کے خیال میں انگریزی اصطلاحات کو جوں کا توں اردو میں درج کر دینا دراصل سہل نگاری کی مثال ہے۔ مضمون نگار نے اصطلاحات کے بے جا استعمال کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ بجائے اصطلاحات کے گورکھ دھندے میں پڑھنے کے سادہ الفاظ میں ان تصورات کو واضح کیا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک مثال دی کہ ملک میں دو مکاتب فکر تھے جو اردو کی ترویج کا کام کر رہے تھے جن میں ایک میجر آفتاب حسن کی سربراہی میں کراچی یونیورسٹی میں کام کر رہا تھا جبکہ دوسرا اشفاق احمد خان کی قیادت میں اردو سائنس بورڈ لاہور میں کام کر رہا تھا۔ جہاں پہلے گروپ نے اردو پر زور دیا جبکہ لاہور کے دوسرے گروپ نے انگریزی اصطلاحات کو استعمال کیا۔

اس کے بعد کراچی سے پاکستان کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے زیر اہتمام شائع ہونے والے رسالے کاروان سائنس میں ان دو انتہاؤں کے درمیان راستہ نکالنے کی کوشش کی تاہم اس کے بعد اردو میں تدریس کا عمل رک گیا اور ساری قوم تعلیم کو چھوڑ کر روشن خیال پاکستان کے نام پر انگریزی نعرے کے پیچھے لگ گئی۔ مضمون نگار کے خیال میں انگریزی اصطلاحات کا استعمال صرف طلبہ کے لیے مشکلات پیدا کرے گا مضمون کے آخر میں کتابیات درج ہیں۔

مضمون کا عنوان: **عباسی دور میں ترجمے کی سرگرمیاں**	
مضمون نگار: اورنگ زیب اعظمی	رسالہ کا نام: معارف
صفحہ نمبر: 33-48	جلد نمبر: 176 شمارہ نمبر: 1
دورانیہ: سہ ماہی	سنہ اشاعت: جولائی 2005 تا دسمبر 2005
مقام اشاعت: اعظم گڑھ	مطبع: معارف پریس، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
ناشر: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	ایڈیٹر: ضیاءالدین اصلاحی

یہ مضمون دراصل عربی میں لکھا گیا تھا جو مصنف کی بیروت سے شائع ہونے والی کتاب کا حصہ تھا جس کا ترجمہ نازش احتشام نے کیا اور یہ معارف میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں خلافت عباسی میں ترجمے کو حاصل ہونے والی شاہی سرپرستی اور اس سے پہلے جاہلی اور ابتدائی اسلامی دور میں فن ترجمہ نگاری کا ذکر کیا گیا ہے۔ مضمون نگار کے مطابق عربی زبان میں ترجمہ کا رواج جاہلی دور سے ہی ہو گیا تھا جس کے ذیل میں مضمون نگار نے مختلف حوالے دیے ہیں جن میں عربوں کے دیگر ممالک سے تعلقاتٔ عربی اشعار میں ان کا ذکرٔ عربوں کے تجارتی اسفارٔ عالمی تعلقاتٔ جاہلی دور میں تورات کا عربی ترجمۂ یونانی اور آرامی ثقافت کی جزیرۂ عرب منتقلیٔ عربی اشعار میں مختلف اسالیب کی موجودگی شامل ہیں۔

اس کے بعد مضمون نگار نے اسلام کے ابتدائی دور میں ترجمے کے کام پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے ذیل میں بطور حوالہ چند مثالیں دی گئی ہیں۔ نجاشی بادشاہ کی قریش کے وفد کے ساتھ مترجم کے حوالے سے بات چیتٔ مختلف صحابہ کا فارسیٔ رومیٔ قبطی اور عبرانی زبانیں جاننا،عبداللہ بن عمرو بن العاص کا قران کے ساتھ ساتھ تورات کا بھی مطالعہ کرنا،اور آپ ﷺ کا حضرت زید کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دینا یہ چند مثالیں بطور حوالہ پیش کی گئی ہیں۔ پھر اس کے بعد اموی دور میں ترجمے کی کاوشوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس دور میں عربی میں متعدد طبّی کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ اس کے علاوہ حضرت معاویہ نے

بہت سے مترجمین کا تقرر بھی کیا تھا تاکہ وہ بادشاہوں کے حالات ترجمہ کر کے ان کے سامنے پیش کر سکیں۔ خالد بن یزید بن معاویہ کے لیے صنعتؑ طب اور نجوم وغیرہ کی کتب ترجمہ کی گئیں۔

اس کے بعد اصل موضوع یعنی عباسی دور میں تراجم کا جائزہ لیا گیا۔ اس دور کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلا دور سفاح سے لے کر امین تک (754-813ء) ، دوسرا دور مامون سے لے کر مقتدر تک (813-908ء) اور تیسرا دور قاہر سے لے کر خلافت عباسیہ کے خاتمہ تک (908-1258ء) پر محیط ہے۔ پہلے دور میں طب فلکیات اور ریاضیات کے ترجمے ہوئے، چونکہ خلیفہ منصور معدے کی تکلیف میں مبتلا رہتا تھا اس نے جالینوس اور بقراط کی بہت سی کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کروایا۔

دوسرے دور میں تصنیفؑ تعلیق اور تلخیص کے ساتھ ساتھ ریاضیاتؑ فلسفہ اور منطق کی کتابوں کے ترجمے کیے گئے جس میں خلیفہ مامون کی ذاتی دلچسپی شامل تھی جیسا کہ وہ طبعاً حکمت و فلسفہ اور منطق کی کتابوں کا دلدادہ تھا۔ اس نے فلسفہ سے متعلق تمام کتابوں کے ترجمے کا حکم دیا جس سے فلسفہ سے نصاریٰ کی دلچسپی بڑھی اور "افلاطونی فلسفہ" نام سے ایک نیا مکتب فکر وجود میں آیا۔ ہارون رشید نے اس زمانے میں کتابوں کے ترجمے کے لیے "بیت الحکمۃ" بھی قائم کیا تھا۔

ترجمہ میں تحریک میں سب سے زیادہ تیزی اسی دور میں دیکھنے میں آئی۔ تیسرا دور فلسفہ کے بجائے فارسی ادب کی کتابوں سے دل چسپی کے لیے مشہور ہے جس کا سبب وہ امرائے حکومت تھے جن کی دل چسپیاں اپنے بزرگوں کی عظمت رفتہ کے احیا سے تھیں۔ آخر میں مضمون نگار نے ترجمہ کے فن سے دلچسپیوں کی وجوہات گنوائی ہیں جن میں قران مجید اور احادیثؐ عربوں کا دوسری قوموں سے سابقہ پیش آنا علمی ترقیؑ مترجمین کی سرپرستی اور اسلام کی تبلیغ واشاعت شامل ہے۔

مضمون کا عنوان: **مشینی ترجمہ کار: مبنی برامثلہ و مصنوعی ذہانت**	
مضمون نگار: محبوب خان	رسالہ کا نام: اخبار اردو
صفحہ نمبر:9-8	جلد نمبر: 26 شمارہ نمبر: 7
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: جولائی2009
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: ورڈ میٹ پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر: معتمد، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	ایڈیٹر: سید سردار احمد پیرزادہ

اس مضمون میں مشینی ترجمہ اس کی تاریخ اور اس کے اپروچس کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مشینی ترجمہ کی شروعات 1954 میں ہوئی جب جارج ٹاؤن یونیورسٹی نے آئی بی ایم سے اشتراک کیا۔ اس تجربے میں خود کار طریقے سے ساٹھ روسی جملوں کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس وقت یہ دعویٰ کیا گیا کہ تین سے پانچ سال میں خود کار مشینی ترجمہ کامیابی سے مکمل کر لیا جائے گا مگر حقیقت اس کے برعکس نکلی اور یہ شعبہ نصف صدی کے بعد بھی ابھی تک تحقیقی کاموں میں حل طلب مسئلہ کے طور پر موجود ہے۔ 1980ء میں اس کام میں نئے سرے سے جان آئی اور شماریاتی انداز سے مشینی ترجمہ کی کوششیں شروع ہوئیں۔ اس کے بعد ترجمہ کے لیے مشین کی ضرورت کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی۔

مضمون میں اس بات کو ابھارا گیا کہ زبان میں موجود ماہر لسانیات نے اس شعبے میں اتنا کام یا تحقیق نہیں کی جتنا انہیں کرنا چاہیے تھا، صرف آئی ٹی کے لوگوں سے یہ کام ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں مرکز فضیلت برائے اردو اطلاعیات، پاکستان کی کوششوں کا جائزہ لیا گیا۔ گو کہ 1998ء سے ہی مختلف ماہرین انگریزی سے اردو مشینی ترجمہ کار کے لیے یہاں کام کر رہے تھے لیکن انھیں کامیابی نہیں مل رہی تھی جیسا کہ وہ سادہ جملوں سے شروعات کر کے اپنے قوانین وضع کرتے تھے تاہم بعد میں انھوں نے مرکب جملوں پر کام کیا اور مبنی برامثلہ مشینی ترجمہ کار کا بنیادی پروٹوٹائپ تیار کیا جس میں مصنوعی ذہانت کی آمیزش کی گئی۔ مشینی ترجمہ پر تنقید بھی بہت کی گئی ہے اور اس میں سرفہرست یہ ہے کہ ایک خود کار مشینی ترجمہ کار ایک

انسانی ترجمہ کار کی جگہ کبھی نہیں لے سکتا۔اس تنقید کے جواب میں اس شعبے میں کام کرنے والوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ اگر یہ ایک انسان کی جگہ نہیں لے سکتا تو بطور ایک ٹول کے مدد گار تو ثابت ہو سکتا ہے۔

مضمون کا عنوان: **اردو میں ادبی ترجمے کی روایت**	
مضمون نگار: ڈاکٹر احمد امتیاز	رسالہ کا نام: اردو ریسرچ جرنل
صفحہ نمبر: 20-26	جلد نمبر: 2 شمارہ نمبر: 1
دورانیہ: سہ ماہی	سنہ اشاعت: جنوری، مارچ 2015
مقام اشاعت: نئی دہلی	مطبع:
ناشر:	ایڈیٹر: عزیر اسرائیل

مضمون نگار نے مضمون کی شروعات اس بحث سے کی ہے کہ آیا ترجمہ کو طبع زاد کے برابر سمجھا جائے۔ان کے خیال میں ترجمہ کو ثانوی سمجھا جاتا ہے لیکن دوسرے فنون کی طرح اس کی بھی حیثیت مسلم ہے۔اس کے بعد انھوں نے ترجمہ کی مختلف تعریفات کا جائزہ لیا اور اس سلسلے میں ماہرین ترجمہ کے حوالے دیے۔ترجمہ کی کامیابی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ وہ اصل متن سے زیادہ دلکش ہو اور اس کو پڑھ کر ایسا معلوم ہو کہ وہ ترجمہ نہیں بلکہ طبع زاد تحریر ہے۔ مضمون نگار کے بقول اردو میں اچھے اور کامیاب ترجموں کی کمی ہے اور ترجمہ کے فن کی پیچیدگی اور مشکلات کے سبب اردو ادب میں ترجمہ کی کمی کا احساس ہمیشہ سے باقی رہتا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے ادب اور غیر ادب کے ترجموں میں فرق کا جائزہ لیا اور کہا کہ ادب کے ترجموں سے فکر میں وسعت آتی ہے۔اس کے بعد لفظ "ترجمہ" کا جائزہ لے کر بتایا گیا کہ کسی بھی ترجمے کو حتمی نہیں کہا جاسکتا۔اس کے بعد ترجموں کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔بعد ازاں ترجمہ کی مشکلات کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس سلسلے میں سب سے پہلی دشواری اصطلاحات سے متعلق ہے۔یہ دشواری سائنسی علوم کے سلسلے میں زیادہ محسوس ہوتی ہے کیوں کہ اصطلاح ایک معین معنی دیتی ہے۔ سائنس کے علاوہ قانون اور عدالتوں کے فیصلوں کے تراجم میں بھی یہ مشکل دیکھنے میں آتی ہے۔دوسری مشکل متبادلات کا انتخاب ہے۔

اس کے بعد عمل ترجمہ میں مترجم کی ذہنی و فکری صلاحیت نیز علمی و ادبی استعداد کی ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مترجم کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ دونوں زبانوں پر دسترس رکھتا ہو اور الفاظ، تراکیب اور اصطلاحیں وضع کرنے کے قابل ہو۔ اس میں ادبی قدروں کا ادراک بھی ہو۔ ادب کے سماجی اور عمرانی رشتوں کا شعور بھی مترجم کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ایک اچھے ترجمہ نگار کے لے ضروری ہے کہ وہ دونوں زبانوں کے الفاظ، محاورے اور تراکیب پر اپنی گہری نظر رکھے۔ اس کے بعد اردو زبان میں ترجمے کے آغاز و ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں زور ادبی تراجم پر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اردو ترجموں میں مختلف اداروں کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مضمون کا عنوان: **ادبی ترجمہ**	
مضمون نگار: ڈاکٹر سید احسان الرحمان	رسالہ کا نام: معارف
صفحہ نمبر: 204-218	جلد نمبر: 180 شمارہ نمبر: 3
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: ستمبر 2007
مقام اشاعت: اعظم گڑھ	مطبع: معارف پریس، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
ناشر: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	ایڈیٹر: ضیاءالدین اصلاحی

مضمون نگار نے ادبی ترجمہ کے ذیل میں صرف قصے کہانیوں کے ترجمے کا جائزہ لیا ہے جس میں ناول اور شعر بھی شامل ہیں۔ مصنف کے مطابق ان تحریروں سے سماج، سماجیات، لوگوں کے رہن سہن کا طریقہ، ان کے رسم و رواج، ان کی روزمرہ زندگی کا احاطہ ہوتا ہے۔ ترجمہ چاہے ادبی ہو یا دوسرے موضوعات پر، اس کو اصول کا پابند ہونا پڑتا ہے کیوں کہ ترجمہ کا اصل مقصد کسی بھی دوسرے کلچر کا ذہنی سفر ہوتا ہے۔ ترجمہ کا مقصد سماج سے متعارف ہونا ہے اس لیے ادبی ترجمہ میں بے جا لفاظی اور کسی بھی قسم کی کانٹ چھانٹ ناروا ہی نہیں بلکہ ناجائز ہے۔

مترجم صرف افکار کو ہی نہیں بلکہ اس زبان میں رچے بسے پورے کلچر کو منتقل کرنے کا ذمہ دار ہے۔ ادبی ترجمہ کے دوران ثقافتی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے جیسے نت نئے محاورے وغیرہ ایسے وقت مترجم کو فٹ نوٹ میں ان کی شرح اور وضاحت کرنی چاہیے۔ کچھ مفکرین کے مطابق کسی ایک زبان کے مفردات دوسری زبان میں ہو بہو نہیں مل سکتے اور کچھ دانشوروں کا ماننا ہے کہ جس خیال کو ایک زبان میں قلمبند کیا جاسکتا ہے اسے دوسری زبان میں بھی جوں کا توں قلمبند کیا جاسکتا ہے۔ لفظوں کے ہیر پھیر میں پڑنے کے بجائے معانی اور مفاہیم پر توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔

مصنف کا ماننا ہے کہ اگر ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرتے وقت کچھ معلومات ضائع ہوتی ہیں تو اس میں مترجم کی غلطی ہے جس میں زبانوں پر گرفت کرنے کی صلاحیت موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہر زبان کے صنائع اور بدائع

مختلف ہوتے ہیں لیکن اس کا قطعاً مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ترجمہ کرنا ناممکن ہوگا۔اس کے علاوہ ترجمہ کرتے وقت واقعات کا محل وقوع،لوگوں کے نام اور مذہب وثقافت بدل دیے جائیں تو اسے ترجمہ ہر گز نہیں کہا جاسکتا۔

ہر زبان کے مفردات اور الفاظ میں اتنی لچک ہوتی ہے کہ ضرورت کے مطابق افکار اور مفاہیم کو منتقل کر سکیں۔ ترجمہ کرتے وقت ایک مکمل زبان داں کا فرض ہے کہ وہ زبان کی ہر چیز کا ہر بات کا مکمل طور پر ترجمہ کرے چاہے وہ زبان کا ثقافتی پہلو ہو یا اصطلاحی۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ مختلف ثقافتی فریم میں رہنے کے باوجود ہم لوگ نہ صرف ایک جیسا سوچتے ہیں بلکہ قریب قریب ایک طرح افکار اور احساسات کا اظہار کرتے ہیں۔ شعر کا منظوم ترجمہ مشکل ترین ہوتا ہے اس لیے مترجم اس عالم یا شاعر کا ہم پلہ ہونا چاہیے جس کے شعر کا وہ ترجمہ کرنا چاہتا ہے۔ شعر کا ترجمہ اس لیے بھی مشکل ہوتا ہے کہ اس میں دریا کو کوزہ میں بند کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ترجمہ ایک ضرورت ہے اور دوسری ضرورتوں کی طرح اس ضرورت کا بھی پورا کیا جانا ضروری ہے،اگر لوگوں پہنچ اصل تک نہ ہو تو وہ اس کا قریب ترین بدل پسند کرتے ہیں۔ ترجمہ کا فن ہر دوسرے فن کی طرح ایک نئی بلندی اور ایک نئے کمال کو پہنچتا ہے اور ہمارے لیے بہتر ہے کہ اور فنون کی طرح ہم اس فن میں بھی طبع آزمائی کرتے رہیں۔

مضمون کا عنوان: **اردو اصطلاحات سازی: ایک نظر واپسیں**	
مضمون نگار: ڈاکٹر عطش درانی	رسالہ کا نام: دریافت
صفحہ نمبر:125-117	جلد نمبر: شمارہ نمبر: 9
دورانیہ: سالانہ	سنہ اشاعت: جنوری2010
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: نمل پرنٹنگ پریس، اسلام آباد
ناشر: نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔	ایڈیٹر: بریگیڈئر (ر) ڈاکٹر عزیز احمد خان ریکٹر

مضمون نگار کی کتاب "اردو اصطلاحات سازی" کا 1994 میں دوسرا ایڈیشن سامنے آیا تھا اس کے بعد اس مضمون میں اس دوران میں اصطلاحات سازی کے میدان میں ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیا گیا۔ سب سے پہلے اصطلاحات کی تعریف پر روشنی ڈالی گئی۔ برٹرینڈ رسل کے مطابق ہر لفظ ایک اصطلاح ہے۔ اشیا بھی اصطلاح نظام کے بغیر اپنا کوئی آزادانہ وجود نہیں رکھتیں۔ اس کے بعد علم اصطلاحات سازی پر گفتگو کی گئی جس کی بنیادیں درجِ ذیل پر ہیں۔

الف۔ تصورات کا تجزیہ کرنا جو کسی سرگرمی کے احاطے میں استعمال ہو رہے ہوں۔

ب۔ تصورات سے وابستہ اصطلاحات کی نشان دہی کرنا۔

ج۔ ایک سے زیادہ زبانوں کے فرہنگ میں صحیح متبادلات متعین کرنا۔

د۔ کاغذ پر ڈاٹا بیس میں اصطلاحات مرتب کرنا۔

ک۔ اصطلاحات کے ڈاٹا بیس کا نظم و نسق چلانا یا بندوبست کرنا۔

مضمون نگار کے مطابق تصورات زبان سے ماورا ہوتے ہیں اگرچہ الفاظ انھیں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے کسی لفظ کے کوئی اصطلاحی معنی نہیں ہوتے۔ تصورات اور اصطلاحات کی معنویاتی مثلث کو اصطلاحیاتی نقطہ نظر سے

ایک مخروط کی صورت میں دیا جاسکتا ہے۔ جس میں تصور اوپر، اصطلاح، شے، تعریف نیچے آتے ہیں۔ اصطلاحوں کے درمیان تعلق کے پچاس درجے ہیں لیکن اصطلاحات کے معنوی نظام کے لیے اس سے کم تعلقات کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً رابطہ کار کا تعلق: مترادفات اور متضادات کا تعلق۔

مضمون نگار نے مزید لکھا کہ اصطلاحات کی معیار بندی کے لیے ISO نے بارہ معیارات مقرر کر رکھے ہیں جن کے نمبر بھی انھوں نے درج کر دیے ہیں۔ مضمون نگار کے مطابق اردو مترجمین کو نئی اصطلاح سازی اور معیارات کے ان امور کا علم ہونا چاہیے۔ اگر کوئی اصطلاح ان معیارات پر پوری اترتی ہے تو وہ قبول ہو گی۔ ذاتی پسند و ناپسند کا اصطلاحات کے علم میں کوئی گزر نہیں۔ انہیں اصطلاح کے پیچھے موجود تصور کو سمجھ کر ہی اردو مترادفات لانے چاہئیں نا کہ لفظ کا ترجمہ۔ اس کے بعد مصنف نے اردو اصطلاحات سازی کے میدان میں پاکستان میں مقتدرہ کے تحت ہونے والی کاوشوں کا ذکر کیا۔ اس کے بعد اردو میں اصطلاحات سازی کے دوران فارسی کے اثرات کا جائزہ لیا گیا۔

تاہم اب جدید فارسی اور اردو میں کافی فرق ہے اس لحاظ سے فارسی سے استفادہ ممکن نہیں رہا۔ مضمون نگار نے سفارش کی ہے کہ بجائے اس کے کہ ہر مضمون میں اصطلاحات سازی وضع کی جائیں کچھ مضامین جیسے ریاضی اور نیچرل سائنسس کے لیے انگریزی اصطلاحات بعینہ لے لی جائیں جبکہ انسانیات (ہیومانیٹیز) میں ٹکسالی زبانوں میں ترجمہ کر کے اصطلاحات لی جائیں۔ تاریخ میں صرف موجود الفاظ کی کمی دور کی جائے۔ آخر میں دنیا بھر میں موجود اصطلاحات کے ذخائر پر روشنی ڈالی گئی اور کہا گیا کہ جب تک اردو والے بجٹ مہیانہ کریں تب تک وہ سائنس و ٹکنالوجی میں ترقی کا خواب نہ دیکھیں۔

مضمون کا عنوان: **اردو اصطلاحات سازی: روایت و مستقبل**	
مضمون نگار: عظمیٰ اجمل	رسالہ کا نام: اخبار اردو
صفحہ نمبر: 7-6	جلد نمبر: 36 شمارہ نمبر: 7
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: جولائی 2018
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: ورڈ میٹ پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر: ایگزیکیٹو ڈائریکٹر (معتمد)، ادارہ فروغ قومی زبان (مقتدرہ قومی زبان) ایچ ۸/۴، اسلام آباد	ایڈیٹر: سید سردار احمد پیرزادہ

مضمون میں سب سے پہلے قومی زبان کی اہمیت بتائی گئی اس کے بعد اصطلاحات سازی پر گفتگو کی گئی۔ لفظ 'اصطلاح' اس کی تعریف، اس کی اہمیت، اس کے آغاز وغیرہ کا تذکرہ کیا گیا۔ مضمون نگار کے مطابق اصطلاح سازی ایک فن ہے جو کہ زبان کی ترقی و ترویج کے لیے ناگزیر ہے۔ اصطلاح سازی کسی بھی زبان کی زندگی کے لیے از حد ضروری ہے۔ جس زبان میں اصطلاح سازی کی روایت موجود نہ ہو وہ بہت جلد زندگی کھو بیٹھتی ہے۔

اردو میں وضع اصطلاحات کا باقاعدہ آغاز 18 ویں صدی کے اوائل ہی ڈاکٹر گلکرائسٹ کی نگرانی میں فورٹ ولیم کالج سے شروع ہوا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ انگریزی ہندوستانی لغت کی اشاعت تھا۔ اس کے بعد دہلی کالج کے دارالترجمہ، سرسید احمد خان کی سائنٹفک سوسائٹی، جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ اور دیگر اداروں نے اردو میں سائنسی علوم کی کتابوں کی منتقلی کے کام کو آگے بڑھایا۔ ان کتابوں کو اردو میں ڈھالنے کے لیے وضع اصطلاحات کے اصولوں کو مرتب کرنا ضروری تھا۔ لہذا اصطلاح سازی کے علم کی بنیاد پڑی۔

وضع اصطلاحات میں نمایاں مقام دہلی کالج کو حاصل ہے جہاں ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم کی گئی۔ اس میں اصطلاحات سازی کے لیے کمیٹیاں بنائیں گئیں۔ ہر کمیٹی کے اراکین اردو کے مزاج کے لحاظ سے الفاظ کو لسانیات کے اصولوں کے تحت وضع کردہ چھلنی سے گزارتے یوں ایک لفظ وضع ہوتا۔ دوسری کمیٹی کے مشورہ کے بعد اسے مستعمل قرار دیا جاتا۔ اس کے بعد

پاکستان میں اصطلاحات سازی کے کام پر روشنی ڈالی گئی۔ اس کے بعد درج ذیل نکات کو اصطلاحات سازی کے فروغ کے لیے ضروری گردانا گیا:

۔ علم اصطلاحات کو باقاعدہ تحقیقی موضوع بنایا جائے۔

۔ اب تک وضع کردہ اصطلاحات کو یکجا کیا جائے تاکہ اس سے اردو کے ذخیرہ الفاظ کا تعین آسانی سے ہو سکے اور علمی و تحقیقی میدان میں کارگر ہو سکے۔

۔ اب تک جن میدانوں میں اصطلاحات سازی کا کام بالکل نہیں ہوا انھیں ترجیح دی جائے۔

۔ بین الاقوامی اصطلاحات سازی کے اداروں سے مشاورت اور ان کے وضع کردہ اصولوں سے استفادہ کیا جائے۔

۔ اصطلاحات سازی کے ادارے تو ہیں مگر حکومتی سرپرستی حاصل نہیں۔ حکومت ترجیحی بنیادوں پر سب اداروں کو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے کی طرف راغب کرے۔

۔ ترجمہ نگاری کے اصولوں اور طریقوں کے لیے باقاعدہ تحقیقی کام کا آغاز ترجیحی بنیادوں پر کیا جائے۔

مضمون کا عنوان: **ترجمے اور اصطلاح سازی**	
مضمون نگار: ڈاکٹر عطش درانی	رسالہ کا نام: اخبار اردو
صفحہ نمبر: 8-6	جلد نمبر: 10 شمارہ نمبر: 11
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: نومبر 1993
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: ورڈ میٹ پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر: مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	ایڈیٹر: ڈاکٹر انعام الحق جاوید

اس مضمون میں لاحقہ مصدری (ize-) اور لاحقہ اسمی (ization-) میں امتیاز کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ انگریزی کے فعل متعدی میں صیغۂ امر کی ایک خاص صورت ہے جسے "منقلب فعل امر" بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ لاحقہ مصدری ize–سے ظاہر کی جاتی ہے۔اس میں کسی اسم کی خاصیت کے ساتھ کسی چیز کی قلب ماہیت کرنے یا بدلنے کا تصور یا حکم (امر) موجود ہے۔ جیسے Magnetize میں "عام لوہے کو مقناطیس بنانے" سے اس کی ماہئیت میں تبدیلی آتی ہے۔ اگر ایسے افعال کے ساتھ De کا سابقہ لگا دیا جائے تو شامل کردہ خاصیت کے "نکالنے یا کھینچنے" کے معنی وجود میں آتے ہیں جیسے Demagnetize وغیرہ۔ نیز اگر Re-کا سابقہ لگا دیا جائے تو تجدید نو کے عمل کا اظہار ہوتا ہے جیسے Remagnetize وغیرہ۔ فلسفہ اور سائنس میں افعال کی کیفیت اور ماہئیت بھی تصورات کی حیثیت سے بنیادی اصطلاحوں کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ چنانچہ فعل امر کے ize–کے لاحقے ہی کے ساتھ اسم مجرد بنانے کے لیے –tion کا ایک اور لاحقہ استعمال میں آیا اور اس کی صورت ization–کی ہوگئی جسے اسم مجرد بھی کہا جاسکتا ہے اور اسم مصدر بھی۔

اردو میں افعال کی صورت انگریزی کی طرز پر نہیں ہے۔ یہاں مصدر ہی اسم مصدر کی صورت میں لکھا جاتا ہے جیسے دیکھنا اور دیکھنا مثلاً "اس کا دیکھنا دیکھا نہ جائے"۔ اسم مصدر اور مصدر دونوں صورتوں کو ظاہر کرتا ہے۔ یا پھر اردو میں حاصل مصدر کو اسم مجرد کا ہم پلہ سمجھ لیا گیا ہے۔ مضمون نگار نے یہاں مجرد اسم کی منقلب صورت سے بحث کی ہے۔ اردو ترجمہ میں جب

یہ مسائل سامنے آئے تو اردو میں اسم مصدر کے لیے بھی مصدر ہی کو استعمال میں لایا گیا۔ مگر مشکل اس وقت آن پڑتی ہے جب ایک ہی مصدر سے اسم مجرد یا کیفیت کی کئی صورتیں پیدا ہوں۔

چنانچہ بعض اصطلاحی لغات میں اس کے لیے اسم کیفیت کے ساتھ ساتھ صیغۂ امر کی مجرد صورت بھی ملحوظ رکھی جانے لگی۔ مگر ابھی اس کے لیے بنیادی اصول تلاش کرنے کا مرحلہ باقی ہے تاکہ اس قبیل کے الفاظ کو بھی اردو کے مزاج سے ہم آہنگ کر کے ترجمہ کیا جاسکے۔ اس کے بعد مضمون نگار نے کئی مثالیں دے کر اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ اصول اور قاعدے اصطلاح سازی کے لیے ضروری تو ہیں لیکن عام زبان و ادب میں چلن اور استعمال ہی کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ہمیں اصطلاحی زبان نیز ادبی اور بول چال کی زبانوں میں بھی واضح فرق اور امتیاز کرنا ہوگا اور ترقی زبان کے لیے تکنیکی اور ادبی زبانوں کا الگ الگ ذوق پروان چڑھانا ہوگا۔ اسی امتیاز سے اردو زبان کو ترقی دے کر جدید علمی تقاضے پورے کیے جاسکتے ہیں۔

مضمون کا عنوان: **اصطلاحی غور و فکر**	
مضمون نگار: سلیم فارانی	رسالہ کا نام: اخبار اردو
صفحہ نمبر: 19-22	جلد نمبر: 5 شمارہ نمبر: 7
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: جولائی 1988
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: ورڈ میٹ پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	ایڈیٹر: شریف کنجاہی

اس مضمون میں مضمون نگار نے اردو میں عربی فارسی کی پہلے سے رائج اصطلاحات کو جوں کا توں قائم رکھنے کی سفارش کی ہے۔ کیوں کہ وہ عوام کی زبان پر چڑھی ہوئی ہیں اور ان کے مفاہیم تک ذہن کے منتقل ہونے کی عادت سی ہو چکی ہے۔ البتہ وہ کہتے ہیں کہ اگر معنوی تحقیق اس پر دال ہو کہ وہ اصطلاح کے جدید مفہوم کے لیے موزوں نہیں بلکہ ابہام اور غلطی پیدا کرتی ہے تب اسے بدلنے میں تامل نہ کیا جائے۔

انھوں نے اس سلسلے میں بعض انگریزی اصطلاحیں بھی اپنانے پر زور دیا تاہم وہ کہتے ہیں کہ انگریزی اصطلاحیں بہت کم اردو میں آنی چاہئیں اور ان میں سے بھی وہی اپنائی جائے جو عام فہم اور عوام کی زبان پر اس طرح رائج ہو چکی ہوں کہ ان میں اجنبیت نظر نہیں آتی اور ان کے لیے اردو میں پہلے سے الفاظ موجود نہیں ہیں۔ انگریزی اصطلاحات کو اردو میں منتقل کرنے سے قبل ان کی ساخت معانی اور مآخذ کی پوری تحقیق کر لینی چاہیے۔ اس کے بعد انھوں نے انگریزی اصطلاحات کی مختلف درج ذیل نوعیتیں بتائیں:

۔ جن کا آسانی سے لغوی ترجمہ ہو اور وہی لغوی ترجمہ اردو میں کام آسکتا ہو۔

۔ ایسے پیچیدہ الفاظ جن کے اشتقاق کا پتہ چل جائے اور اس کے مطابق اردو میں مادہ لے کر الفاظ بنائے جا سکتے ہوں۔

۔ایسی اصطلاحات جن کا اشتقاق ہی مشکوک ہو۔ان میں یا تو تصرف کر لیا جائے یا ویسا ہی رہنے دیا جائے۔

۔ایسی اصطلاحات جو دریافت کرنے والوں کے نام پر رکھی گئی ہوں۔

۔اشیا کے ایسے نام جو ہندی، عربی یا فارسی سے انگریزی میں منتقل ہوئے تھے۔

۔ایسی اصطلاحات جو روم و یونان و دیگر ممالک کی میتھالوجی کے قصوں کہانیوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

۔ایسی اصطلاحات جو معنوی حیثیت سے اس چیز کی غلط خاصیت کو ظاہر کرتی ہیں۔

۔ایسی اصطلاحات جن میں اصطلاحی مفہوم کی جھلک نمایاں طور پر نہیں ہوتی۔

اس کے بعد مضمون نگار نے نئی اصطلاحات کی وضع بندی کے عمل میں درجِ ذیل نکات کو ملحوظ رکھنے کی درخواست کی ہے۔

۔انگریزی اصطلاح کے صحیح لغوی معنی اور اس کے لحاظ سے اردو میں کون سا لفظ ہے۔

۔اردو میں اگر اس کے لیے لفظ موجود نہیں ہے تو عربی یا فارسی میں اس کے لیے کون سا لفظ موجود ہے۔

۔اصطلاح کے لغوی معنی اور صحیح مفہوم میں کوئی فرق تو نہیں۔

۔جو لفظ لیا جا رہا ہے وہ ان زبانوں میں عام مستعمل ہے یا نہیں۔

بہر حال مقصود یہ ہے کہ صحیح علمی و فنی اصطلاحیں زبان اور تراکیب کے لحاظ سے اردو زبان کی نوعیت کے مطابق ڈھالی جائیں اور اس سلسلے میں تاخیر نہ کی جائے۔

مضمون کا عنوان: **اردو میں دوسری زبانوں سے ترجمے کی روایت اور مسائل**	
مضمون نگار: قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی	رسالہ کا نام: اردو دنیا
صفحہ نمبر: 26-25	جلد نمبر: 15 شمارہ نمبر: 03
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: مارچ 2013
مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل، نئی دہلی۔	مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا، انڈسٹریل ایریا، فیز۔II، نئی دہلی۔110020
ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	ایڈیٹر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

اردو زبان وادب کے مالامال ہونے کا ایک سبب متعدد زبانوں کا علمی وادبی سرمایہ اس زبان میں منتقل ہوتا رہا ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے تاہم اس کی رفتار سست ہے۔ افسوس کہ دارالترجمہ عثمانیہ کے بعد اردو زبان میں ترجمے کو ایک مشن کے طور پر لے کر آگے بڑھنے والا کوئی دوسرا بڑا ادارہ وجود میں نہ آسکا۔ حیدرآباد میں حکومت کی توجہ سے ابوالکلام آزاد سنٹرل یونیورسٹی کے قیام سے اس بات کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ اردو میں ملک اور بیرون ملک کی دیگر زبانوں سے علمی اور دانشورانہ کارناموں کو بڑے پیمانے پر منتقل کیا جاسکے گا۔ تاہم مضمون نگار کا احساس ہے کہ یہاں بھی زیادہ تر زور انگریزی سے اردو ترجمہ پر ہی ہوگا۔ اس کے بعد مضمون نگار ہندی سے اردو میں علمی مواد کی منتقلی کا جائزہ لیا ہے۔

اس کے بعد وہ مغربی زبانوں سے اردو میں تراجم کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ چنانچہ اواخر 19 ویں صدی سے انگریزی، جرمن، فرنچ، اور روسی زبانوں سے اردو میں براہ راست اور بالواسطہ تراجم کی شکل میں شعر وادب، فلسفہ، سیاست و معیشت، سائنسی علوم، ریاضی، علم طب، علم افلاک اور دیگر موضوعات پر مبنی کتب و رسائل کے دفاتر اردو میں منتقل کیے گئے۔ مشرق کے بارے میں مغرب کا یہ خیال رہا ہے کہ یہ ہمیشہ سے کم وقعت اور پسماندگی کا شکار رہا ہے۔

اب خصوصاً انگریزی سے اردو میں جتنے بڑے پیمانے پر فکر ودانش کو منتقل کیا گیا ہے شاید ہندی یا علاقائی زبانوں سے اتنا مواد کسی عہد میں اردو میں منتقل نہیں ہوا۔ اردو میں تراجم کی اس روایت کے تناظر میں بعض ایسے مسائل کا بھی مختصر ذکر

ضروری معلوم ہوتا ہے جو ہمیشہ اس مرحلے میں پیش آتے ہیں۔ ادبی متون اگر بلند پائے کے ہوں تو اس میں معنی خیزی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ شعری متن میں استعارہ، علامت اور دیگر اشارے زبردست تہذیبی دباؤ کے متحمل کم ہی ہو پاتے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ترجمہ شدہ متن ان قباحتوں کے سبب اصل متن سے بہت قریب ہوتے ہوئے بھی یک گونہ فاصلہ رکھنے پر مجبور ہے۔

مضمون کا عنوان: **اصطلاحات سازی۔ ضرورت و اہمیت**	
مضمون نگار: ڈاکٹر محمد اشرف کمال	رسالہ کا نام: دریافت
صفحہ نمبر:116-110	جلد نمبر: شمارہ نمبر: 9
دورانیہ: سالنامہ	سنہ اشاعت: جنوری2010
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: نمل پرنٹنگ پریس، اسلام آباد
ناشر: نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔	ایڈیٹر: بریگیڈئر (ر) ڈاکٹر عزیز احمد خان ریکٹر

مضمون نگار نے مضمون کی شروعات میں اصطلاحات سازی کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ زبانوں کی طرف سے نئے الفاظ اور ان کی اصطلاحات کو اپنے دامن میں سمیٹنے سے ہوتی ہے۔اسکے بعد انہوں نے اصطلاحات کی مختلف ماہرین کے ذریعے پیش کی گئی تعریفات کو بیان کیا۔انہوں نے لکھا کہ جدید علوم وفنون کے پھیلاؤ نے تمام علمی و ادبی منظر نامے کو بدل کر رکھ دیا ہے اور سائنس کے شعبے میں روزافزوں ہونے والی ایجادات اور اختراعات اس امر کی متقاضی ہیں کہ زبان کو بھی سائنس کے ہم پلہ بنانے کے لیے اس میں مناسب ضروری تبدیلیاں لائی جائیں اور اس ضمن میں اصطلاحات سازی سے کام لیا جائے۔اس کے علاوہ قومی وجود کو برقرار رکھنے اور اجتماعی شعور کو استحکام دینے میں بھی زبان کا کردار اہم ہے چنانچہ ایک وسیع تر قومی زبان کی ترویج اور فروغ کے امکانات سے پہلو تہی کرنا دراصل قومی وجود اور ملکی سالمیت کے منافی ہے۔

اس کے بعد مضمون نگار نے قومی زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔بعدازاں وہ لکھتے ہیں کہ اردو زبان کی ترقی کے لئے اصطلاحات سازی کے علم کو فروغ دینا اور بدیسی الفاظ کی مناسب معیاری اور مستند

اصطلاحات کو رائج کرنا نہایت ضروری ہے۔جدید علوم میں اصطلاحات سازی ایک اہم اور نازک مرحلہ ہے اور جو زبان اس نازک مرحلے سے عہدہ برآ ہو جاتی ہیں وہ زندہ جاوید رہتی ہیں

۔اصطلاحات سازی کے لیے الفاظ و تراکیب کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرتے وقت دونوں زبانوں کے مزاج سے الفاظ کی بناوٹ اور الفاظ کی نشست و برخاست کا خیال رکھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اصطلاحات سازی۔وہ لکھتے ہیں کہ اگر اصطلاح میں مفہوم کی طرف اشارہ موجود نہ ہو تو ایسی اصطلاح بے فائدہ ہے جس سے زبان کو فائدے کے بجائے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔پھر مضمون نگار نے اصطلاحات سازی اور ترجمے کے درمیان فرق بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ اصطلاحات کے لیے نہایت سوچ بچار اور غور و فکر سے کام لینا پڑتا ہے اور اس کے لیے وسیع مطالعہ اور ذخیرہ علم کا ہونا ضروری ہے۔اردو زبان کی یہ خوش قسمتی رہی ہے کہ اس کا تعلق ہمیشہ ترقی یافتہ علمی اور ادبی زبانوں سے رہا ہے اور اس میں دوسری زبانوں سے الفاظ و تراکیب لینے اور اصطلاح سازی کے وسیع امکانات موجود ہیں۔اردو مخلوط زبان ہونے کی وجہ سے دوسری زبانوں سے علمی استفادہ کرنے کی بھرپور صلاحیت سے مالامال ہے۔اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ جو اصطلاحات زبان کے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ عوام کے مزاج اور روز مرہ بول چال میں شامل ہےانھیں برقراررکھناہی بہتر ہوتا ہے۔مضمون نگار نے جابجا حوالے دیے ہیں اور سادہ مثالیں پیش کرتے ہوئے اپنی بات میں زور پیدا کیا ہے۔

مضمون کا عنوان: **سوانح اور خاکے کا ترجمہ فن اور مسائل**	
مضمون نگار: ڈاکٹر فاخرہ نورین	رسالہ کا نام: دریافت
صفحہ نمبر:124-110	جلد نمبر: شمارہ نمبر: 14
دورانیہ: سالنامہ	سنہ اشاعت: جنوری2015
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: نمل پرنٹنگ پریس، اسلام آباد
ناشر: نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔	ایڈیٹر: ڈاکٹر روبینہ شہناز، ڈاکٹر عابد سیال

مضمون نگار نے اپنے مضمون میں ایک نئے موضوع کو پیش کیا ہے یعنی سوانح اور خاکہ نگاری کے ترجمے میں کن چیزوں کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے سوانح اور خاکہ نگاری کے درمیان فرق کو بیان کیا گیا ہے اور ان دونوں اصناف کی فکری و فنی خوبیاں درج کی گئی ہیں۔اس کے بعد وہ خاکہ اور سوانح کے تراجم کے مسائل کی طرف آتے ہیں اور انہوں نے خصوصی طور سے انگریزی سے اردو میں خاکہ اور سوانح کے ترجمے کے آنے والے مسائل پر بات کی ہے اور کہا ہے کہ اگر مترجم کسی غیر ملکی زبان اور ثقافت سے تعلق رکھتا ہو تو نہ صرف ترجمہ کے لیے اس کا انتخاب اس کا انداز اور یہاں تک کہ نیت بھی ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔عموما انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے مترجم نفسیاتی مرعوبیت کا شکار ہو جاتا ہے جس کی وجہ تہذیبی و تاریخی ہے۔

سوانح یا خاکوں کے ترجمے میں اسلوبیاتی سطح پر مسائل اور دیگر اصناف کے ترجمے قدرے کم ہوتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ انگریزی زبان سے مرعوبیت نے اردو جملے کی نحوی ساخت کو تبدیل کر دیا ہے۔انگریزی زبان کے اس تتبع کی معاشرتی ثقافتی لسانی اور نفسیاتی وجوہات ہیں۔اردو زبان میں اصناف نظم و نثر کی ایک خاصی تعداد انگریزی ہی سے آئی ہے۔اور یہ ترجموں کی دین ہیں لہذا اس کے اثرات معنوی و فکری سطح پر ہی نہیں بلکہ لفظیاتی اور معنوی سطح پر بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

اس کے ذیل میں مضمون نگار نے اسٹیفن ہاکنگ کی سوانح کا اردو میں ہونے والا ترجمہ بطور مثال پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں ترجمے کی حکمت عملی وہی ہے جو عموما انگریزی ناول اور سوانح کا مترجم اپناتا ہے یعنی پڑھنے کے ساتھ ساتھ ترجمہ کرتے چلے جانا اور لفظی ترجمہ کرتے ہوئے جہاں ممکن ہو تلخیص پیش کرنا یعنی پیراگراف حذف کردینا تاکہ قاری کی تفہیم میں رکاوٹ نہ آئے۔اس کے بعد مضمون نگار نے اس کتاب کے ترجمے کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مترجم نے محض ترجمہ پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ تمام تر خصوصیات اور اہداف مقدمے میں درج کر دیئے جو اس کے مطلوبہ تھے جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مترجم کو جہاں بھی موقع ملا ہوگا اس نے مصنف کے بیان کو مزید واضح ہے اور ابہام سے پاک کرنے کی سعی کی ہوگی۔

مضمون کا عنوان: **دفتری اردو میں ترجمے کی مشکلات**	
مضمون نگار: ڈاکٹر خالد اقبال یاسر	رسالہ کا نام: دریافت
صفحہ نمبر:121-112	جلد نمبر: شمارہ نمبر: 16
دورانیہ: سہ ماہی	سنہ اشاعت: جون تا دسمبر،2016
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: نمل پرنٹنگ پریس،اسلام آباد
ناشر: نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز،اسلام آباد۔	ایڈیٹر: ڈاکٹر روبینہ شہناز،ڈاکٹر عابد سیال

چونکہ یہ مضمون پاکستان کے پس منظر میں تحریر کیا گیا ہے اس لیے مضمون نگار سب سے پہلے یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ جب اردو ہماری اپنی قومی زبان ہے تو اسے بطور دفتری زبان رائج کرنے کے لئے تراجم کی کیا ضرورت ہے یعنی پہلے اصل مواد اردو میں لکھا جانا چاہیے اور پھر اسکا دیگر زبانوں میں ترجمہ ہو نا چاہئے اس لحاظ سے دفتر ی زبان کے اردو میں تراجم کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔

پھر وہ ترجمے کے مسائل پر بات کرتے ہیں اس کے بعد کہتے ہیں کہ اردو کو بطور دفتری اور قومی زبان نافذ کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ہمارا ملک ایک کثیر اللسانی معاشرہ ہے اور اردو ملک کے کسی بھی خطے کی زبان نہیں ہے۔جمہوریت ہو یا آمریت ہر جگہ ہر وقت انگریزی زبان اقتدار اور ملکی وسائل پر قبضہ کا ایک اہم وسیلہ رہا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ یہ بھی عجیب و غریب معاملہ ہے کہ ہم اپنی مادری زبانوں کو جدید زبانوں کے برابر لانے کے لیے کوئی عملی تگ ودو نہیں کرتے اسی وجہ اردو زبان کا ارتقاء سست ہو گیا ہے ورنہ ہندی عربی اور فارسی کے انتظار کے بعد الفاظ محاورات اور ترکیبوں کی آمیزش سے اسے اور زیادہ متمول بنایا جا سکتا تھا۔

انہوں نے حیدرآباد دکن کی مثال پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی تقسیم سے پہلے ریاست حیدرآباد میں اردو کو بطور دفتری اور تعلیمی زبان استعمال کرنے کا تجربہ کامیابی سے جاری تھا اس کے علاوہ

ریاست بہاولپور نے بھی اردو زبان کی سرپرستی جاری رکھی اور آج بھی بھارت کی کئی ریاستوں میں اردو کی سرکاری حیثیت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔پورے بھارت میں اردو اکادمیوں کی تعداد 26 سے زائد ہے جن کا مجموعی بجٹ اربوں میں ہے۔لیکن ہماری حکومتیں اردو کی صلاحیت کو مان کر اسے دفتری زبان رائج کرنے کے بجائے لیت و لعل سے کام لے رہی ہیں۔اس کے بعد مضمون نگار نے ترجمے کے مسائل سے نمٹنے کی راہیں بتائیں ہیں جو درج ذیل ہیں۔

۔ مترجم تربیت یافتہ ہوں اور ترجمے کی مختلف ترکیبوں سے واقف ہو۔

۔ اسے دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہو۔

۔ ثقافتی پہلو سے آشنا ہوں لیکن متعصب نہ ہو اور انگریزی ترکیب کو اردو صوتیات میں درج کرنے سے نہ کترائے۔

۔ رموموز اوقاف کو سلیقے سے استعمال کرے۔

۔ انگریزی کی رائج اصطلاحات کو باقی رہنے دے۔

۔ اردو ترجمے کے دوران انگریزی میں سوچنے کی عادت ترک کی جائے۔

ایک اور مسئلہ یہ بھی ہے کہ اردو کے فروغ کے لیے قائم اداروں کے سربراہ اردو ادب کے اساتذہ میں تلاش کیے جاتے ہیں جو ان اداروں میں چور دروازے سے تعینات ہوکر اپنی محرومیوں کا ازالہ کرتے ہیں اور اپنے اپنے ذاتی شوق پورے کرتے ہیں۔انگریزی زبان حکمران طبقوں کی حکمرانی کے تسلسل کی ضمانت ہے اس لئے عدالت اسے ترک کرنے کے لئے تیار نہیں۔ترجمہ میں حائل سب سے سنگین رکاوٹیں انتظامی نوعیت کی ہیں۔مترجمین کے مسائل بھی انہی سے پیدا ہوتے ہیں۔مترجمین مسلسل محنت اور تجربے سے ترجمے کے مسائل پر قابو تو پا سکتے ہیں لیکن بطور مترجمین اپنے پیشے کو درپیش مسائل پر قابو پانے کی قدرت نہیں رکھتے۔ترجمے سے متعلقہ ادارے مالی اور انتظامی ابتری کا شکار ہیں اور وہ مترجمین کو محنت کے مطابق معاوضہ دینے کی اہلیت نہیں رکھتے جس سے مترجمین کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر ترجمے کی مشکلات اور مترجمین کے مسائل کو ایک دوسرے سے جدا

نہیں کیا جاسکتا۔چنانچہ اردو کو دفتری زبان بنانے کے لیے ترجمے کی نہیں بلکہ اردو میں سوچنے سمجھنے اور لکھنے کی ضرورت ہے۔

مضمون کا عنوان: **اردو میں مشینی ترجمہ کے مسائل**	
مضمون نگار: پرویز احمد اعظمی، حافظ صفوان محمد چوہان	رسالہ کا نام: قومی زبان
صفحہ نمبر:54-45	جلد نمبر:02 شمارہ نمبر: 12/1
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: دسمبر۔جنوری 2010-11
مقام اشاعت: دفتر اردو اکیڈمی، حج ہاوز، نامپلی، حیدرآباد۔	مطبع: طٰہٰ پرنٹ سسٹم، عابڈس، حیدرآباد۔
ناشر: دفتر اردو اکیڈمی، حج ہاوز، نامپلی، حیدرآباد۔	ایڈیٹر: فائق احمد

مشینی ترجمے سے مراد ایک انسانی زبان کے متن کا دوسری انسانی زبان میں سافٹوئیر کی مدد سے ترجمہ کرنا ہے۔ترجمے کا عمل دو سطحوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ 1۔متن کے ماخذ کا مفہوم سمجھنا۔2 ۔ اس مفہوم کو مطلوبہ زبان میں ڈھالنا۔

اس کے لیے مترجم کو متن کی خصوصیات اور ساخت کا تجزیہ اور تشریح کرنی ہوتی ہے یہ وہ عمل ہے جس کے لئے زبان کے ماخذ لفظیات اور محاورات وغیرہ کا گہرا علم ہونا ضروری ہے ۔ہدفی زبان سے آگاہی بھی اشد ضروری سمجھی جاتی ہے۔مشینی ترجمہ کیلئے کئی طریقہ کار استعمال کیے جاتے ہیں۔مشینی ترجمہ کار لسانیاتی قواعد کی بنیاد پر بنایا گیا کوئی طریقہ استعمال کرسکتا ہے جس میں الفاظ لسانی حساب سے ترجمہ کیے گئے ہو۔مشینی ترجمے کے بیشتر طریقہ داخل کردہ متن کو زبان کی قواعدی حیثیت میں ڈھالتے ہیں اور اسے عارضی رموزی صورت میں منتقل کردیتے ہیں جس سے مطلوبہ زبان کا متن تشکیل پاتا ہے۔

متن کی اس صورت کی نوعیت کے مطابق بین لسانی مشینی ترجمہ یا تبدیلی کی بنیاد پر ترجمہ ان میں سے کوئی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ان طریقوں سے ترجمہ کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر گرامر کے قوانین کے ساتھ ساتھ بڑے ذخیرہ ہائے الفاظ اور لغات کی بھی ضرورت ہوتی ہے جن میں تصریفی

،نحوی اور معنوی معلومات ہو۔اگر بہت سارا تربیتی مواد مشینوں میں جمع کردیا جائے تو مشین ویسا ہی ترجمہ کرتی ہے جیسا ایک انسانی مترجم کرتا ہے۔تاہم مشکل یہ ہے کہ فی الحال مناسب حال ڈیٹا دستیاب نہیں ہیں۔

کمپیوٹر کی معاونت سے کیے جانے والے ترجمے کے چار اصولی طریقے ہیں ۔1۔ قواعدی مشینی ترجمہ ، 2۔مثال پر مبنی مشینی ترجمہ، 3۔شماریاتی مشینی ترجمہ،4 ۔ دوغلا مشینی ترجمہ۔

کمپیوٹر کی زبان میں لفظ کی تعریف یہ ہے کہ یہ حروف تہجی کا ایسا سلسلہ ہے جو دو خالی جگہوں کے درمیان ہوتا ہے۔اس لحاظ سے اردو میں املا کے بہت سے مسائل ہیں۔ اس کے بعد مضمون نگار نے چاروں طریقوں کی تفصیلات سمجھائی ہے اور ان کے مسائل اور تحدیدات کو بیان کیا ہے۔

مضمون کا عنوان: **عصر جدید میں ترجمے کی افادیت**	
مضمون نگار: ارشاد نیازی	رسالہ کا نام: اردو دنیا
صفحہ نمبر: 20-24	جلد نمبر: 15 شمارہ نمبر: 08
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: اگست 2013
مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل، نئی دہلی۔	مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا، انڈسٹریل ایریا، فیز۔II، نئی دہلی۔110020
ناشر: ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند۔	ایڈیٹر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

اگر ادب، سماج کا آئینہ ہے تو ترجمہ ادبی و تہذیبی ارتقاء کی شناخت اور رفاقتوں کے احساس کا نام ہے ۔عہد موجود میں ترجمے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔تہذیب کے ارتقا کا عمل حقیقت میں ترجمے کی بنیاد پر قائم ہے۔یہ انسانی تجربے کا حصہ رہا ہے کہ جب جب دو تہذیبوں کا ٹکراؤ ہوا ترجمے نے دونوں کے مابین پل کا کام انجام دیا۔اجنبیت کو کم کرنے میں ترجموں کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔اردو تو ایک باقاعدہ زبان بنی ہی ترجمہ کی بدولت ہے۔ایک زبان کے بولنے والے گروہ یا جماعت میں فکر و خیال اور جذبات و احساسات کے لیے ایک ہی زبان کا استعمال کیا جاتا ہے مگر دو مختلف زبانوں کے بولنے والوں کے مابین تبادلہ خیال کے لئے ترجمے کی ضرورت ہوتی ہے۔

سائنس کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں اور نئی نئی تحقیقات و ایجادات نے انسانی زندگیوں کو آسانیاں فراہم کی ہیں لیکن ان سائنسی تحقیقات سے تعارف ترجمے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔پہلے ایک ملک میں ہوئی ایجادات بہت دیر سے دوسرے ملکوں تک پہنچتی تھی لیکن آج جب دنیا کی طنابیں کھینچ رہی ہیں اور

عالمگیر سطح پر ایک اکائی بنتا جا رہا ہے جب تک نئے خیالات کا خون رگ و پے میں سرایت نہ کرے گا زندگی دشوار ہے۔ ترجمہ مختلف زبانوں کے بولنے والوں کے مابین رشتہ اخوت و محبت کی ایک مضبوط کڑی ہے۔

ہندوستان جیسے عظیم ملک کے لئے لسانی سطح پر ترجمے کی ضرورت ہمیشہ سے رہی ہے۔پورے ہندوستان میں جاری فکری و تہذیبی اسلوب کو ہم ترجمہ کے وسیلے سے ہی جان سکتے ہیں اور اس سے قومی اتحاد کو طاقت بھی ملتی ہے۔صنعتی و تجارتی دنیا میں بھی ترجمہ کی بڑی اہمیت ہے اور ہندوستان میں تاجروں اور صنعتکاروں کو اپنا وجود باقی رکھنا ہو تو انہیں ترجمے کی مدد لینی ہوگی۔صنعت و تجارت کے بعد ذرائع ترسیل و ابلاغ میں بھی ترجمہ روح کی طرح موجزن ہے۔ تقابلی مطالعے کے افق کو بھی وسیع کرنے میں ترجمہ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

تقابلی مطالعہ کے ادبی فکری لسانی موضوعاتی اور اسلوبیاتی رجحانات سے ادب کو ترقی ملتی ہے اور نئے نئے الفاظ اصطلاحات محاورات کہاوتیں اور ضرب الامثال ایک ادب سے دوسرے ادب میں داخل ہوتے ہیں۔مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ ترجمہ انسانی شعور اور عالمی فکر و تہذیب میں رشتہ اخوت و محبت اور مساوات قائم کرنے والا پل ہے جو علم و ادب اور سائنس و ٹکنالوجی کے شعبے میں علاقائیت اور قومیت کے سمٹے اور محدود دائرے سے باہر نکل کر انسانی اتحاد اور جذباتی رشتے کے ارتقا کا جواز فراہم کرتا ہے۔دراصل یہی ترجمہ کی ضروریات اہمیت معنویت کا مضبوط اور بین ثبوت ہے۔

مضمون کا عنوان: **فن ترجمہ نگاری :حدود اور امکانات**	
مضمون نگار: سید احسان الرحمن	رسالہ کا نام: اردو دنیا
صفحہ نمبر:13-11	جلد نمبر: 8 شمارہ نمبر: 8
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: اگست2006
مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل، نئی دہلی	مطبع:ایس نارائن اینڈ سنز،بی۔88،اوکھلا،انڈسٹریل ایریا،فیز۔II، نئی دہلی۔110020
ناشر: ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند۔	ایڈیٹر: ڈاکٹر آر۔کے۔ بھٹ

مترجمین جانتے ہیں کہ زبان صرف افکار کا گہوارہ نہیں ہوتی بلکہ اس میں زندگی کے دیگر پہلو بھی شامل ہوتے ہیں اس میں اس قوم کا مذہب ثقافت اس کی صنعتی اور سائنسی ترقی اس زبان کے بولنے والوں کے اخلاقیات اور ان کا تہذیبی معیار بھی شامل ہوتاہے ۔جب کسی زبان کے سرمایہ کو کسی دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے تو کچھ نہ کچھ نقصان کا اندیشہ ضرور رہتا ہے اسی لئے ترجمے کو انتقال معانی کہا گیا ہے۔

کسی نے کہا ہے کہ ترجمہ ہوسکتا ہے جبکہ دیگر کہتے ہیں کہ ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ جب ہم ایک کپ سے دوسرے کپ میں چائے انڈیلیں گے تو کچھ نہ کچھ تو زمین پر گرے گی ہی ۔اس لئے ماہرین لسانیات کا یہ مشورہ ہے کہ ترجمہ کرتے وقت ہماری توجہ کا مرکز زیادہ تر وہ پیغام ہونا چاہیے جو اصل زبان کے ذریعے ہم تک پہنچتا ہے اس لئے مترجمین کو امانت داری کا پورا پورا خیال رکھنا چاہیے۔ ہر زبان میں ایسی اصطلاحات ہوتی ہیں جن کا ترجمہ ناممکن ہوتا ہے لیکن ایسے حالات میں مترجم کو کیا کرنا چاہیے اس

کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ ان کو قریب ترین مساوی معنی میں بیان کرکے اصل کو حاشیے میں دیا جائے اور اس کا سماجی اور ثقافتی پہلو واضح کیا جائے۔

اگر کسی زبان میں کئی رشتوں کے لئے ایک لفظ ملتا ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ زبان نامکمل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی ایک زبان میں کسی ایک معنی میں استعمال شدہ لفظ صرف مفرد ہو جبکہ اسی معنی کا لفظ کسی دوسری زبان میں جمع میں استعمال ہوتا ہو۔چنانچہ بعض ماہرین کہتے ہیں کہ ترجمہ اصل سے قریب بھی ہونا چاہیے اور ترجمہ کرتے وقت ضروری نہیں کہ ایک کے لئے ایک کی تلاش کی جائے۔ایک اور اہم خوبی جو مترجم میں ہونا ضروری ہے وہ یہ کہ زبان پر گرفت کے ساتھ ساتھ اسکی موضوع پر بھی گرفت مضبوط ہونی چاہیے ۔اکثر شکی مزاج لوگ ایک شخص سے ترجمہ کر آنے کے بعد اس کو کسی دوسرے شخص سے رائے لینے کے لئے پیش کرتے ہیں جسے Vetting کہا جاتا ہے ایسا کرنا بری بات نہیں لیکن اکثر بے ڈھنگے لوگ بے ڈھنگے طریقے سے Vetting کرتے ہیں۔ چنانچہ شروع میں ہی ایک اچھا اور قابل اعتماد مترجم تلاش کرلینا چاہیے۔ترجمہ ایک ایسا عمل ہے جس کو ہر زبان دا ں اس بلندی سے انجام دیتا ہے جہاں وہ کھڑا ہوتا ہے۔

مضمون کا عنوان: **ترجمے کا فن**	
مضمون نگار: ڈاکٹر خالد ندیم	رسالہ کا نام: اخبار اردو
صفحہ نمبر:20-24	جلد نمبر: 26 شمارہ نمبر: 2
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: فروری،2009
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: ورڈ میٹ پرنٹرز،اسلام آباد
ناشر: مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد	ایڈیٹر: سید سردار احمد پیرزادہ

دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ترقی یافتہ اقوام کے علوم و فنون سے دیگر اقوام کے حصول کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے چنانچہ تہذیبی و ثقافتی اور علمی و ادبی لین دین اور اعمال میں ترجمہ بنیادی کردار ادا کرتا ہے ترجمہ کو دو زبانوں کے درمیان پل بھی کہا جاتا ہے۔ ترجمہ ایک ایسا عمل ہے جس میں ایک زبان کے متن کو دوسری زبان میں پیش کیا جاتا ہے۔ایک تعریف کے مطابق ترجمہ نقل کلام ہے اس لیے نقل کلام کا تقاضہ یہی ہے کہ کلام جس زبان میں نقل ہو جائے اس میں تقریبا ویسا ہی اثر پیدا ہو جیسا اصل زبان میں ہوا تھا یعنی صرف متبادل متن ہی نہ ہو بلکہ متبادل تاثرو کیفیت بھی پیدا ہو۔لیکن عملاً ایک زبان سے دوسری زبان میں مفہوم کے ساتھ وہی آب و رنگ چاشنی اور خوشبو لانا ناممکن ہے جو اصل عبارت میں موجود ہو اور بالخصوص شاعری میں تو مطالبات مزید بڑھ جاتے ہیں۔

ترجمہ خود ایک پیچیدہ عمل ہے۔ترجمہ کا بنیادی تقاضا کسی تصنیف میں شامل خیالات و افکار کے ساتھ ساتھ اس تصنیف میں پوشیدہ تہذیب و ثقافت اور مذہبی و سیاسی نظریات معاشرتی و معاشی تصورات اور اسلوب کو منتقل کرنا ہے۔چونکہ ترجمہ دو تہذیبوں کے درمیان خلیج کو پاٹنے کا کردار ادا کرتا ہے اس لئے مترجم کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے مترجم کے لئے تصنیف اور ترجمے کی زبان پر عبور ضروری ہے اگر وہ مصنف کے الفاظ میں پوشیدا روح کو نہ پا سکے تو وہ کامیاب مترجم نہیں کہلا سکتا چنانچہ مترجم

کے لیے اسی پائے کے علم اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کتاب فن پارے کے مصنف کا ہو۔ترجمے میں مصنف کے مقابلے میں دہری دہری صلاحیت کی ضرورت پڑتی ہے متن کی زبان اور اپنی زبان تو آنی چاہیے اس موضوع سے مناسبت درکار ہے جو متن میں موجود ہے۔اچھا ترجمہ اسی وقت وجود میں آسکتا ہے جب مترجم اپنی شخصیت کو کھو کر مصنف کی شخصیت تلاش کرنے کی کوشش کرے چنانچہ مترجم کو ایک مصور اور اداکار کی طرح مصنف کے ساتھ ہلاک ہونا پڑتا ہے تب جاکر آرٹ بنتا ہے۔

مترجم کی حیثیت مصنف کے مخالفت کی ہے اور وہ تخلیق کار سے کم درجے کا حامل ہے۔ہر ادب پارے کی اپنی بوباس ہوتی ہے یہ بو باس اس فضا میں رچی بسی ہوتی ہے جس میں ایک مصنف سانس لیتا ہے یہ بوباس ایک خاص علاقے میں بسنے والے لوگوں کی زندگی سے متعلق اجتماعی رویے سے پھوٹتی ہے اور جب ایک مترجم کسی مصنف کی تحریر کو ان عناصر کے ساتھ اپنی زبان میں لے آتا ہے تو اس کی یہ کوشش ثانوی درجے سے بلند ہوکر تخلیقی ادب کی بلندیوں تک پہنچ جاتی ہے اسی لئے امریکہ میں ترجمے کو دوبارہ تخلیق بھی کہا جاتا ہے۔ایک اچھا ترجمہ ہمیشہ تخلیقی ہوتا ہے اس لئے کہ ترجمے سے متبادل اور مترادف الفاظ کی تلاش کرنا نہیں بلکہ ان افراد کی رہنمائی مقصود ہوتی ہے جو دوسری زبان کو نہیں جانتے۔مترجم کی بدنصیبی ہے کہ ایک طرف اس کی کاوش کو تخلیق نہیں سمجھا جاتا اور دوسری طرف اسے اس طرح ترجمہ کرنا ہوتا ہے کہ اجنبیت کا احساس بھی باقی نہ رہے۔تہذیبی و علمی میدان میں ترجمے کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

کسی عہد میں تخلیقی عمل سست روی کا شکار ہو تو ایسے دور میں قوم کی بڑی خدمت یہی ہے کہ ترجمے کے ذریعے دنیا کی اعلیٰ درجے کی تصانیف اپنی زبان میں لائی جائیں۔ترجمے کے ذریعے زبان کی اعتبار سے پھلتی پھولتی ہے نئے الفاظ استعاروں کے روپ میں جنم لیتے ہیں اور نئے علوم و فنون سے آشنائی ہوتی ہے۔ادبیات عالم کا ارتقا تراجم ہی کا مرہون منت ہے۔ جس طرح دیئے سے دیا جلتا ہے اسی طرح

علوم سے علوم پیدا ہوتے ہیں تیسری دنیا میں ترجمے کو اب تک حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے حالانکہ یہ کام مغرب میں بھی ان لوگوں نے انجام دیا جو اپنی اپنی زبانوں کی آبرو تھے۔

علمی تراجم میں سائنسی علوم و فنون اور غیر ادبی تراجم شامل ہیں ایسے تراجم میں لفظ کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے ادبی تراجم میں شعرو سخن اور افسانوی نثر شامل ہوتی ہیں اس کی روح اور زبان و بیان کی اہمیت ہوتی ہے صحافتی ترجمہ میں وقت کی ضرورتوں اور فوری ابلاغ پر توجہ دی جاتی ہے۔ترجمے کی تین قسمیں ہیں لفظی ترجمہ آزادترجمہ اور معتدل ترجمہ۔

مضمون کا عنوان: **صحافتی ترجمے کے مسائل**	
مضمون نگار: اسد رضا	رسالہ کا نام: اردو دنیا
صفحہ نمبر:27-29	جلد نمبر: 12 شمارہ نمبر: 3
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: مارچ2010
مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل، نئی دہلی	مطبع:ایس نارائن اینڈ سنز،بی۔88،اوکھلا،انڈسٹریل ایریا،فیز۔II،نئی دہلی۔110020
ناشر: ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند۔	ایڈیٹر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

فن ترجمہ کی جڑیں عہد قدیم میں پیوست ہیں۔یونان ہندوستان ایران اور چین جیسے متعدد ممالک میں یہ فن عیسوی سن سے قبل ہی وجود میں آ چکا تھا لیکن چھاپہ خانے کی ایجاد اور کتب کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد فن تدوین و ترجمہ سے ہزاروں افراد وابستہ ہو گئے اور اس کی باقاعدہ تربیت دی جانے لگی۔1822ءمیں اردو اخبار" جام جہاں نما" کی اشاعت کلکتہ سے شروع ہوئی تو ترجمے کے ماہرین کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے۔

اردو میں اس کے ماہرین خاصی تعداد میں ملنے لگے ہیں۔ آج کل ترجمے سے متعلق نظریاتی تعلیم دی جاتی ہے لیکن عملی تربیت کی کمی محسوس ہوتی ہے اس لیے ترجمہ کرتے ہوئے اکثر ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔صحافت میں ترجمے کی انتہائی زیادہ اہمیت ہے کیونکہ تقریبا 80 فیصد خبروں اور مضامین کا دیگر زبانوں سے ترجمہ ہی کیا جاتا ہے۔صحافت میں خبروں اور مضامین کا ترجمہ نہایت عجلت میں کیا جاتا ہے

اسی لئے ایک مفکر نے کہا ہے کہ صحافت عجلت میں لکھا ہوا ادب ہے۔صحافت میں کہیں لفظ بلفظ ترجمہ کی ضرورت ہوتی ہے اور کہیں آزاد ترجمہ کی۔

صحافت میں سب سے بڑا مسئلہ اصطلاحات کے ترجمہ کا ہے اصطلاح سازی میں مرکزیت کے فقدان کی وجہ سے ہر ایک نے اپنی اپنی اصطلاحات الگ بنا لی ہیں اس سے صحافیوں میں یہ تذبذب پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ کسی لفظ کا ترجمہ کیا کریں۔میڈیا کا مقصد زبان کو آسان بنانا اور عام آدمی تک خبروں کی ترسیل کرنا ہے لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ کچھ غلط اصطلاحات بھی ہندی کے نام پر اردو اخبارات میں نظر آنے لگی ہیں۔چنانچہ مترجمین کی تربیت کے لیے خصوصی ورکشاپ اور ریفریشر کورس کا اہتمام کرنا چاہیے کیونکہ کسی بھی زبان کو بنانے اور بگاڑنے میں اخبارات اور صحافی بھی اہم رول ادا کرتے ہیں۔اردو صحافت نے کمپیوٹر اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کا استعمال خوب ہو رہا ہے تاہم ابھی املا اور ہجوں کو درست کرنے والا سافٹ ویئر موجود نہیں ہے۔اردو صحافت کی زبان اور اس کے ترجمے کے مسائل پر بھی خصوصی توجہ دینے اور انہیں منصوبہ بند طریقے سے حل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

مضمون کا عنوان: **دارالترجمہ کی مجالس وضع اصطلاحات**	
مضمون نگار: محمد نصیر احمد عثمانی	رسالہ کا نام: مجلہ عثمانیہ
صفحہ نمبر:48-44	جلد نمبر: شمارہ نمبر:62
دورانیہ:	سنہ اشاعت:1960-1959
مقام اشاعت: جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔	مطبع:
ناشر:	ایڈیٹر: ہاشم حسن سعید

1917ء میں جامعہ عثمانیہ کی بنیاد حیدرآباد میں ڈالی گئی۔ اس جامعہ میں اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا اورطے پایا کہ انگریزی کی مستند کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے لہذا سب سے پہلے ایک شعبہ سر رشتہ تالیف و ترجمہ قائم کیا گیا جو صرف دارالترجمہ کہلایا جاتا رہا۔ اس میں مختلف مضامین کے مترجم مقرر کیے گئے اور اس کے پہلے ناظم مولوی عبدالحق صاحب قرار پائے۔اصطلاحات وضع کرنے کے لئے مجلس وضع اصطلاحات قائم کی گئی۔ طبیعیات، کیمیا، ریاضیات کے لئے ایک مجلس قائم ہوئی اور فنون کے لیے دوسری ۔بعد میں حیاتیات، طب اور انجینئرنگ کے شعبے کھولے گئے تو ان کے لیے علیٰحدہ مجلس قائم کی گئی۔

زبان کے نمائندوں میں مولوی وحید الدین سلیم،نواب حیدر یار جنگ، علی حیدر نظم طباطبائی اور مرزا محمد ہادی رسوا شریک رہتے تھے۔وحید الدین سلیم الفاظ کے سادہ استعمال کے حامی تھے۔انہوں نے ایک کتاب وضع اصطلاحات لکھی جو اپنی نوعیت کی بے مثال کتاب ہے۔نواب بہادر یار جنگ،علی حیدر طباطبائی کلکتہ میں واجد علی شاہ کی صحبتوں میں رہ چکے تھے اس لیے ان کی زبان شستہ ہو گئی تھی اور وہ سند کا درجہ رکھتے تھے۔ان کو الفاظ میں شان و شوکت بہت مرغوب تھی۔

مرزا محمد ہادی رسوا لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور لکھنؤ کی زبان کے لیے گویا سند تھے ۔برسوں منطق کا درس لکھنؤ میں دیا اور کچھ دنوں جامعہ عثمانیہ میں بھی رہے۔مولوی عبداللہ عمادی جونپور کے رہنے والے تھے۔ عربی اور فارسی پر اچھا عبور رکھتے تھے اردو میں ہمیشہ موزوں اور شاندار الفاظ کا انتخاب کرتے تھے۔ الفاظ کا ذخیرہ بہت وسیع تھا۔یہ چاروں حضرات زبان کی نمائندگی کرتے تھے۔ میرے ذمے طبیعیات کی نمائندگی تھی۔ کیمیاء میں شروع میں چودھری برکت علی شعبے کے صدر نشین تھے۔

مجلس وضع اصطلاحات کا طریقہ کار یہی تھا کہ الفاظ کی فہرست پہلے سے تیار ہو کر ہر ایک رکن کے پاس بھیج دی جاتی لہذا جب وہ لفظ پیش کیا جاتا تو اس کا ترجمہ بھی پیش کیا جاتا اور اگر کسی کو اعتراض نہ ہوتا تو صدر اسے ایک رجسٹر میں درج کر لیتے اور اگر مختلف ترجمے پیش ہوتے تو ان پر بحث ہوتی اور جو طے پاتا اسے درج کر لیا جاتا۔

دارالترجمہ نے اصطلاحات کی مجلسوں کے ذریعے علوم و فنون کی ہزاروں اصطلاحات کے ترجمے کیے۔انجمن ترقی اردو کی طرف سے تین رسالے شائع ہوتے تھے۔ ان میں بوقت ضرورت دارالترجمہ کے اصطلاح ہی استعمال ہوتی تھی۔انجمن ترقی اردو نے اصطلاحات پر نظر ثانی کا کام بھی انجام دیا۔جامعہ عثمانیہ میں تقریبا تیس سال تک اصطلاح سازی کا یہ کام جاری رہا۔1356ھ میں دارالترجمہ کی اصطلاحات "نشری اصطلاح "کے عنوان سے سر رشتہ نشریات لاسلکی سرکار اعلیٰ کی طرف سے شائع کی گئی اس میں جملہ 520 اصطلاحات درج ہیں۔کوئی 12 نشستوں میں یہ الفاظ وضع کیے جاسکے۔

مضمون کا عنوان: **دارالترجمہ حیدرآباد دکن اور وضع اصطلاحات**	
مضمون نگار: ڈاکٹر مولوی عبدالحق (مرحوم)	رسالہ کا نام: اخبار اردو
صفحہ نمبر:27-24	جلد نمبر:4 شمارہ نمبر: 9
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: ستمبر 1987
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: ورڈ میٹ پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	ایڈیٹر: شریف کنجاہی

ترقی یافتہ ممالک میں لوگ اپنے پیشوں میں نئی باتیں پیدا کرتے ہیں۔ علمی تحقیقات کرتے ہیں جن سے دنیا میں انقلاب آتا ہے اور انہیں علمی تحقیقات کی وجہ سے نئے الفاظ اور اصطلاح بنتی اور رواج پاتی ہیں۔ہمارے پاس اہل علم نے اشاعت علم اور اپنی زبان کو ترقی دینے کا بیڑا اٹھایا تو ترجمہ و تالیف کے ذریعے اس کام کو انجام دینا شروع کیا لیکن ہر علم میں نئے الفاظ کی کثرت اور نئی اصطلاحات کی وجہ سے اکثر باہمت اصحاب نے اس کام کو چھوڑ دیا۔

ترتیب کے لحاظ سے پہلے زبان پھر لغت اور پھر اصطلاحات کی تدوین ہوتی ہے لیکن ہمیں اس کا الٹا راستہ اختیار کرنا پڑا یعنی پہلے اصطلاحات کی لغت ترتیب دینی پڑیں تاکہ مترجمین کو سہولت ہو۔لیکن اصطلاحات سازی کا جو کچھ تھوڑا بہت کام ہوا وہ بہت ناکافی تھا۔

آخر انجمن ترقی اردو نے اس کے بین بین تجویز کی یعنی مختلف علوم پر کتابیں لکھوائیں اور ساتھ ہی اصطلاحات مدون کی جائیں۔ یہ طریقہ بہت معقول تھا مگر یہ عمل بہت سست رہا۔اسی زمانے میں حیدرآباد دکن میں یونیورسٹی قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا جس میں ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ لہذا یہاں پہلے ایک دارالترجمہ قائم کیا گیا اور حسن اتفاق سے اس کی نظامت بھی انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری کو دی

گئی اور اس دیرینہ تمنا کے پورے ہونے کا سامان غیب سے ہو گیا۔یہاں اصطلاحات کا جو مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے یہ انجمن ترقی اردو اور دارالترجمہ یعنی سر رشتہ تالیف و ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کی متفقہ کوشش کا نتیجہ ہے۔

اصطلاحات کے وضع کرتے وقت درج ذیل اصول ہمارے پیش نظر تھے۔پہلا خیال یہ تھا کہ اصطلاحات وضع کرنے کے لئے ماہران زبان اور ماہران فن دونوں کا اکٹھا ہونا ضروری ہے تاکہ جو اصطلاح بنائی جائے وہ زبان کے اور فن کے دونوں سانچوں میں ڈھلی ہوں۔

۔۔وضع اصطلاحات میں عربی، فارسی، ہندی، ترکی سے بلاتکلف مدد لی جائے۔

۔۔الفاظ کے اشتقاق و ترکیب میں کسی خاص زبان کے فائدے کی پابندی نہ کی جائے۔لفظ دوسری زبان سے لیا جائے لیکن نحوکے قاعدے صرف اردو کے ہی ہوں۔

۔۔حتی الامکان مختصر الفاظ وضع کیے جائیں۔

۔۔غیر زبانوں کے اسماء سے مصادر بنائی جاسکتی ہیں۔

۔۔قدیم اصطلاحات کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے۔

۔۔جو اصطلاحات موجدوں کے نام پر رکھی گئی ہیں انہیں بدستور رہنے دیا جائے۔

۔۔اصطلاحات عام فہم بنائی جائیں اور ایسے مادوں سے وضع کی جائے جو زبان میں عام طور سے رائج ہیں۔

۔۔بلاوجہ خواہ مخواہ غیر زبانوں سے الفاظ مستعار نہ لیے جائیں۔

ہو سکتا ہے کہ ہماری بعض ترکیبیں نا مانوس معلوم ہو اوربعض مصنوعی نظر آئیں لیکن ہماری نیت نیک، ہمارا اصول مستحکم ہے اور ہم علم کو عام کرنا چاہتے ہیں۔

مضمون کا عنوان: **فن ترجمہ اصول و مبادی**	
مضمون نگار: عطش درانی	رسالہ کا نام: اخبار اردو
صفحہ نمبر:8-4	جلد نمبر: 2 شمارہ نمبر: 1
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: جنوری1985
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: ورڈ میٹ پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	ایڈیٹر: شریف کنجاہی

فن ترجمہ ایک ایسا میدان ہے جسے نظری اور اصولی پہلوؤں سے نظرانداز کیا جاتا رہا ہے حالانکہ مسلمانوں کے ہاں ترجمے کی ایک زریں تاریخ ہے اور ابتدائی عہد میں مسلمانوں کے پاس ترجمہ کی رفتار کافی تیز تھی تاہم اگلے پانچ سو سالوں میں یہ سیاسی وجوہات کی بنا پر سست پڑ گئی ۔حالانکہ عالمی سطح پر فن ترجمہ عروج پر ہے اور یہ ایک بنیادی علمی ضرورت بن گیا ہے۔اس مضمون میں اردو میں فن ترجمہ کا علمی و نظری جائزہ لیا گیا اور اس کے تکنیکی اصولوں کو مبسوط انداز میں پیش کیا گیا۔سب سے پہلے تو یہ ذہن میں رہے کہ کسی فن پارے کے مفاہیم کو ترجمہ کے ذریعے دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں کیونکہ ہر زبان کا اپنا مزاج اپنا آہنگ اور اسلوب ہوتا ہے۔

پاکستان میں مختلف اداروں کے علاوہ انفرادی سطح پر بھی بہت سارے افراد ترجمہ کے کام کو انجام دے رہے ہیں مگر ان سب کاوشوں میں ترجمہ کو اس کے تکنیکی اصولوں کے ساتھ بہت کم برتا گیا ہے۔جب ہم ترجمے کی سطح کی بات کرتے ہیں تو دراصل ہم اس بات کو ملحوظ رکھتے ہیں کہ انسان کی سماجی صورتحال اس سطح کے ساتھ کیوں کر نسبت رکھتی ہے ۔اس کو ہم لسانیاتی تجزیہ بھی کہتے ہیں آگے چل کر یہ تجزیہ قواعد اور صوتیات کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔

لسانیاتی نظریہ کی رو سے فن ترجمہ تقابلی لسانیات کی ایک شاخ ہے۔ زبانوں کے درمیان یہ تقابلی مطالعہ ان میں یکسانیت تلاش کرنا نہیں ہوتا بلکہ دو طرفہ تبدیلی مفہوم کا جائزہ لینا مقصود ہوتا ہے۔لیکن فن ترجمہ یک طرفہ کارروائی کا نام ہے۔اس میں ایک زبان کے متن کے متبادل کے طور پر دوسری زبان کا متن پیش کیا جاتا ہے۔اس تعریف میں متن اور متبادل کے دو الفاظ اصطلاحی معنی میں آئے ہیں۔

ترجمے کی تکنیک متون کے مطالعے اور متبادلات کی اسی پیشکش کا نام ہے جس میں کئی سطحیں درپیش ہوتی ہیں۔افقی سطح پر ترجمے کی تین اقسام ہیں علمی ترجمہ، ادبی ترجمہ، صحافتی ترجمہ۔ یہ تمام اقسام عمودی طور پر دو طرح کی ہوتی ہیں کلّی اور جزوی ترجمہ۔ اس کے آگے مزید دو اقسام ہیں۔لفظی ترجمہ بامحاورہ ترجمہ۔

تحدیدی ترجمہ ۔اس کی عام طور پر چار اقسام ہوتی ہیں۔صوتیاتی ترجمہ، ترسیمی ترجمہ، لفظی متبادلہ اور لسانیاتی ترجمہ۔

کلی ترجمے میں متن کو زیادہ تر زیر مشق بنایا جاتا ہے جبکہ جزوی ترجمے میں ادبی متن کو عام طور پر اسی انداز سے پیش کیا جاتا ہے۔لسانیاتی طور پر کلی اور جزوی ترجمہ میں صرف کچھ تکنیکی امتیاز کیا جاتا ہے۔ویسے تو سوفیصد کلی ترجمہ ممکن نہیں ہے چنانچہ کلی ترجمے میں ہم الفاظ کے بدلے الفاظ اور صوتیات کے بدلے صوتیات اور ترسیمیات کے بدلے ترسیمیات استعمال کرتے ہیں۔

ایک چیز یہ ملحوظ رہے کہ نحوی ترجمہ ممکن نہیں ہوتا۔ترجمے کی حدود کا تعین کرتے وقت ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ لفظ بلفظ ترجمہ ہے یا با محاورہ ترجمہ ہے یا کھلا ترجمہ۔ایک اچھا ترجمہ ہمیشہ تخلیقی ہوتا ہے اور کوئی شخص اگر اصل کو پڑھ لے تو ترجمہ کو پڑھتے ہوئے بھی اسے وہی زور بیان اور فصاحت اور بلاغت ملے جو اصل میں موجود تھی۔مترجم کسی دوسرے کی تخلیق کی بازیافت کرتا ہے اس لئے ترجمہ کو باز تخلیق کہا جائے گا۔

جدید دور میں فن ترجمہ صحافتی ادبی اور علمی ضرورت بن گیا ہے۔جب ہم ترجمے کے اصول و مبادی کا ذکر کریں گے تو لسانیاتی مسائل اور اسلوب کے مباحث کو بھی پیش نظر رکھا جائے گا۔چونکہ فن ترجمہ زبان سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کے نظری پہلو کو ہم ترجمے کا لسانیاتی نظریہ قرار دے سکتے ہیں۔لسانیاتی نظریہ بنیادی طور پر ایک سائنسی نظریہ ہے جو زبان کے بارے میں ہمارے مطالب اور مشاہدات کو عمومیت بخشتا ہے۔ترجمے کی تکنیک جان لینا زیادہ مشکل کام نہیں مگر ترجمہ کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں مختصرا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ترجمے کے لئے تین باتیں ضروری ہیں۔

۔۔اصل زبان اور ہدفی زبان دونوں پر مکمل عبور حاصل ہو۔

۔۔مضمون اور علم و ادب کی اس شاخ کی مبادیات سے واقف ہو جس کا ترجمہ مقصود ہے۔

۔۔فن ترجمہ کی تکنیک سے بخوبی واقف ہوں اور اس سلسلے میں صاحب اسلوب ہو۔

فن ترجمہ سے واقفیت اور صاحب اسلوب ہونا بنیادی اور کڑی شرط ہے یہی وجہ ہے کہ ترجمہ کے ڈھیر کے باوجود بہت کم ترجمہ فنی اور تکنیکی معیار کو پہنچتے ہیں۔

مضمون کا عنوان: **موجودہ طرز معاشرت اور ترجمہ**	
مضمون نگار: ڈاکٹر ابو شہیم خان	**رسالہ کا نام: اردو ریسرچ جرنل**
صفحہ نمبر: 62-69	جلد نمبر: شمارہ نمبر: 2 1
دورانیہ: سہ ماہی	سنہ اشاعت: اکتوبر، دسمبر 2017
مقام اشاعت: نئی دہلی	مطبع:
ناشر:	ایڈیٹر: عزیر اسرائیل

اس مضمون میں ترجمہ کے لیے مشین یا کمپیوٹر کے استعمال کی تاریخ اور اس کے لیے اختیار کیے جانے والے طرز کار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ گرچہ سترہویں صدی میں میکانکی لغات اور آفاقی زبانوں کے تصور کے ساتھ ہی مشینی ترجمہ بھی زیر بحث آیا تھا لیکن 1933ء میں فرانس کے جارجز آرٹسرونی (Georges Artsrouni) اور روس کے پیٹر ٹرو جانس کج (Trojans Kij Petr) کے دو پیٹنٹ سے اس کے علمی خدوخال کی طرف پیش رفت ہوئی۔ آرٹسرونی کی میکانیکی کثیر لسانی لغت اور پیٹر کی میکانکی لغت مستقبل کا بیش قیمتی سرمایہ ثابت ہوئیں۔

ان دونوں کی کوششوں سے ماہر قلمیات انڈرو بوتھ (Andrew Booth) اور وارن ویور (Warren Weaver) نے 1946-47 میں کمپیوٹر کی آمد کو ترجمہ نگاری کے میدان میں بھی استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا اور میکانکی لغت کا شکلیاتی تجزیہ پیش کرنے کی مزید کوششوں کے بعد ترجمہ میں کثیر المعانی الفاظ سے پیدا ہونے والی مشکلات کے ازالے کی بھی تجویز پیش کی جو امریکہ میں مشینی ترجمہ کی جاری کوششوں میں ایک سنگ میل ثابت ہوئی۔

مشینی ترجموں کے فروغ میں بیسویں صدی کی پانچویں اور چھٹی دہائیاں بہت اہم ہیں۔ 1951-52 میں میساچیوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی (MIT) میں مشینی ترجمہ پر پہلی اور تاریخی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اس میدان سے تعلق رکھنے والے دنیا کے تمام اہم لوگوں نے شرکت کی اور مشینی ترجمہ کی ضرورت، اہمیت اور حدود پر گراں قدر اور مستقبل کے لئے مشعل راہ ثابت ہونے والا جامع خاکہ پیش کیا۔ 1965 تک 17 اداروں میں 20 ملین ڈالر سے زائد لاگت کے ساتھ خود کار ترجمہ کے پروجیکٹ پر کام شروع ہو گیا تھا لیکن جلد بازی اور نتائج کی زور یابی کے باعث یہ تمام کوششیں بہت زیادہ با رآور ثابت نہیں ہو سکیں نتیجتاً امریکہ کی نیشنل سائنس فاونڈیشن Foundation National Science نے ایک مشاورتی کمیٹی (ALPAC) Automatic Language Processing Advisory Committee تشکیل کی۔ اس کمیٹی کا مقصد مشینی ترجموں پر جاری تمام پروجیکٹس پر ایک جامع رپورٹ تیار کرنا تھا۔ ایک سال کے بعد اس کمیٹی نے سفارش کی کہ مشینی ترجمہ انسانی مترجمین کے بہ نسبت زیادہ سست رفتار، مبہم اور دوگنا خرچیلا ہے اور مستقبل قریب میں اس کی افادیت کے امکانات بھی غیر واضح ہیں۔ اس لیے موجودہ مترجمین کو خود کار لغات جیسے نئے وسائل سے مدد تو لینی چاہیے لیکن اس پر مکمل انحصار نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے یہ بھی سفارش کی کہ شماریاتی لسانیات کے میدان میں ہمیں اپنی کوششیں اور تعاون جاری رکھنا چاہیے۔ مشینی ترجمہ کے میدان میں تحقیق کرنے والوں نے ان سفارشات کی مخالفت کی اور اسے جلد بازی میں لیا گیا فیصلہ قرار دیا۔

بہر کیف اس رپورٹ کا نقصان یہ ہوا کہ اس میدان میں تحقیق کرنے والوں اور اس میں سرمایہ لگانے والوں کے جذبات ہر سطح پر سرد پڑ گئے اور چند ہی ادارے اس پروجیکٹ کو جاری رکھ سکے اور دائرہ کار کو بھی کافی محدود کر لیا۔ لیکن بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں ففتھ (5th) جنریشن کمپوٹر کی آمد نے مشینی ترجمہ کو ایک بار پھر عام تحقیق کا موضوع بنایا جس سے مشینی ترجمہ کے مختلف طریقہ ہائے کار وجود میں آئے اور خود کار ترجمہ کے لئے مختلف پروگرام شروع کئے گئے جیسے مارک (Mark –II) جارج ٹاؤن ایم ٹی نظام (Georgetown MT System) سسٹران (SYSTRAN) اور لوگوز (LOGOS) ان سبھی پروگراموں کا دائرہ محدود تھا اور انھیں بہت محدود

تکنیکی مواد کے تراجم کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ان پروگراموں کو عملی جامہ پہناتے وقت جو طریقہ کار اپنائے گئے یا اپنانے کی خواہش ظاہر کی گئی انھیں ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

Direct Mechine Translation Approach 1

Rule Based Approach 2

1980 کے بعد مشینی ترجمہ کا ایک اور طریقہ کار موضوع بحث بنا جسے ہم Corpus Based Approach کہتے ہیں

Direct Mechine Translation Approach 1

اس کے بعد ہندوستان میں مشینی ترجمہ کی کاوشوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

بیسویں صدی کی آٹھویں اور نویں دہائیوں میں ہندوستان میں مشینی ترجمہ پر تحقیقی کام شروع ہوا۔ابتدا میں صرف حکومتی اداروں نے اس میں دلچسپی ظاہر کی لیکن بعد میں نجی شعبوں نے بھی اس میں سرمایہ کاری کو منفعت بخش سمجھا، فی الحال بہت سے تجرباتی اور عملی پروجیکٹ چل رہے ہیں جن میں انگریزی سے ہندوستانی زبانوں اور ہندوستانی زبانوں سے انگریزی میں مشینی ترجمہ کی کوشش ہو رہی ہیں۔کچھ ایسے ہی پروجیکٹ ہیں جن میں ہندوستانی زبانوں کے آپس میں تراجم کی کوششیں کی جارہی ہیں اور مشینی ترجمہ کو کار گر بنانے کے لئے بہت سے آلہ کار کو بھی فروغ دیا گیا ہے۔ جیسے مورفولوجیکل انالائزرز (Morphological analyzers)پارٹ آف اسپیچ ٹیگرس(Part of speech Taggers) اور لینگویج پارسر(Language parsers)وغیرہ

ہندوستان میں مشینی ترجمہ کے میدان میں کافی تحقیق ہو چکی ہے بہت سے ایسے تحقیقی پروجیکٹ ہیں جن کا شمار مشینی ترجمہ کے بنیادی تحقیقی کاموں میں ہوتا ہے۔

(1) انگلا بھارتی اور انو بھارتی ایم۔ٹی پروجیکٹ(Anglabharti and Anubharti M.T. Project)

(2) منترا ایم۔ٹی پروجیکٹ(Mantra M.T. Project)

(3) انوسارک ایم۔ٹی پروجیکٹ(Anusark M.T.Project)

(4)یو۔این ایل پر مبنی مشینی ترجمہ(UNL based M.T.)

(5) مترا مشینی ترجمہMATRA MT System

بہر کیف اس تفصیل کی اجمال یہ ہے کہ سائنس و ٹکنالوجی کے دور میں ترجمہ کے عمل کو زود یاب، موثر اور منظم بنانے کی کوششیں کا فی برسوں سے جاری ہیں لیکن بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں ایف اے ایچ کیو ٹی (Fully Automated High Quality Translation) منصوبے کے تحت تراجم کو بہتر بنانے کی کوششوں میں سرعت آئی۔ اس منصوبے کی ناکامیابی کے بعد ایم اے ٹی پی یو ٹی (Maximum Assistance in Understanding and Translation ,Text Processing) منصوبہ عمل میں تو آیا لیکن کمپیوٹر کا استعمال عام ہونے و کمپیوٹر کاری کے زور پکڑنے سے ترجمہ کے عمل کو بھی کمپیوٹر سے جوڑا گیا۔ سی اے ٹی (Computer Aided Translation) کے توسط سے اے ایل پی نیٹ (Automated Language Processing Network) منصوبہ شروع کیا گیا۔ اس منصوبہ کی کامیابی و ناکامی دراصل اصطلاحات کے مناسب نظام، مشین یا کمپیوٹر کے مطابق و قابل مطالعہ متون کی فراہمی اور معاون نظام پر منحصر تھی۔ لیکن مناسب عملہ کی کمی، زیادہ لاگت اور مزید درکار تعاون کے باعث خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوسکے۔ اس کے باوجود ماہرین شماریاتی لسانیات(Computational Linguisticians) اس میدان میں سرگرم تحقیق و تطبیق ہیں نیز جدید ترین مخصوص سافٹ ویئر پر تحقیق جاری ہے۔ فی الحال عالمی بازار میں اس سافٹ ویئر کی مانگ تو بہت ہے لیکن کمپیوٹر

کے موافق متن و اصطلاحات کی فراہمی، کثیر لاگت، ماہرین شماریاتی لسانیات کی قحط وغیرہ موجودہ مشینی ترجمے کے اصل مسائل و چیلنجز ہیں۔

مضمون کا عنوان: ترجمہ: **ایک تہذیبی ولسانی مفاہمہ**	
مضمون نگار: ڈاکٹر ابو شہیم خان	**رسالہ کا نام: اردو ریسرچ جرنل**
صفحہ نمبر: 22-17	جلد نمبر: شمارہ نمبر: 09
دورانیہ: سہ ماہی	سنہ اشاعت: ستمبر، دسمبر 2016
مقام اشاعت: نئی دہلی	مطبع:
ناشر:	ایڈیٹر: ڈاکٹر عزیر اسرائیل

تمام علمی وادبی کارناموں کی طرح ترجمے کا بھی راست تعلق ترسیل اور ابلاغ سے ہے ۔ ترسیل اور ابلاغ کو موثر، بلیغ اور مفرح بنانا اور بنائے رکھنا ہمیشہ ایک چیلنج رہا ہے خاص طور پر تخلیق کاروں کے لیے۔ اس چیلنج سے نبرد آزمائی میں ترجمے کی ایک تاریخی اہمیت ہے کیوں کہ ترجمہ تجربے کی تشکیل نو اور ترسیل کے ساتھ تخئیل کو بھی بال وپر عطا کرنے میں معاون ہوتا ہے۔اسی لیے جملہ امور عالم میں جو سرگرمیاں سب سے زیادہ اہمیت وقدر وقیمت رکھتی ہیں ان میں ترجمہ کو بھی شامل حال سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک مستقل فن ہے جس میں دسترس کے لیے شوق وصلابت، مشق ومزاولت درکار ہے۔ یہ فن مشرق ومغرب کی بعض یونیورسٹیوں میں ایک علاحدہ مضمون کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔

ترجمہ ادبی تنقید کی ایک شاخ یعنی تقابلی مطالعہ کو ایک نئی جہت عطا کرتا ہے۔اس تقابلی مطالعے کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں کہ ایک دور میں مختلف تہذیبوں کا طرز فکر اور احساس وجمالیاتی قدریں ایک دوسرے سے کتنی مماثلت یا اختلاف رکھتی ہیں۔ کسی تہذیب میں رونما ہونے والے واقعات کس طرح اثرانداز ہوتے ہیں اور ان کا انداز بیان کیا ہے؟ اور پھر مختلف ادوار میں فکری وجمالیاتی تحریکات جو ادب کو متاثر کرتی ہیں ان کا دائرہ محض کسی زبان وادب تک محدود نہیں رہتا بلکہ ان سرحدوں کو

پار کر کے دوسری زبانوں اور ان کی ادبیات تک پہنچتا ہے۔ اس سے نئے موضوعات، اسالیب و طرز فکر کی نشو و نما بھی ہوتی ہے۔

ترجمہ کے چند اصول حسبِ ذیل ہیں۔

1 ۔ جس زبان سے ترجمہ کیا جارہا ہے اس زبان کی لغت سے، اصطلاحات اور محاروں سے، کسی قدر ادبیات سے اور تھوڑی بہت تاریخ سے واقفیت اور نکھرا ہوا ذوق ضروری ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جس زبان کی تصنیف کا ترجمہ کرنا ہے اس زبان پر مترجم کو ماہرانہ عبور حاصل ہو۔

ایک ہی مترجم کا دو زبانوں پر بیک وقت عبور حاصل ہونا کافی مشکل شرط ہے اور ایسے مترجمین کی تعداد نہیں کے برابر ہوگی۔ اس لیے مترجم جس زبان سے ترجمہ کر رہا ہے اس زبان کے کتابی علم سے تھوڑی بہت یا جتنی زیادہ واقفیت ہو اچھا ہے تاکہ وہ اصل عبارت کے سیاق و سباق اور خیال کی نزاکتوں کو پورے طور سے سمجھ کر ترجمے میں منتقل کر سکے۔

2۔ جس زبان میں ترجمہ کرنا ہے اس پر ماہرانہ عبور حاصل ہو۔ اس کی تفصیل ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے یوں بیان کی ہے :

''... تصنیف کی زبان سے کہیں زیادہ قدرت اس زبان میں ہونی چاہیے جس میں ترجمہ کرنا مقصود ہے۔ یہاں تک کہ اس زبان میں خود لکھ لینے کی اچھی خاصی مشق اور اس زبان کا پہلودار علم ہونا چاہیے۔ پہلودار علم سے مراد یہ ہے کہ اس کے ماخذ کا جہاں جہاں سے وہ سیراب ہوئی ہے ان سرچشموں کا، اس کے نشیب و فراز کا علم ہو۔ الفاظ کہاں سے آئے، کیونکر آئے، ان کے لغوی معنی کیا تھے، اصطلاحی معنی کیا ہو گئے اور کیا کیا ہو سکتے ہیں۔ ان کے روزمرہ اور محاورے کیونکر بنے۔ انھیں مختلف موقعوں میں کیسے کیسے استعمال کیا گیا اور آئندہ کیسے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ان میں مختلف اوقات میں کیا تبدیلیاں ہوئیں اور ان تبدیلیوں کی بنیاد پر اور کیا

تبدیلیاں ممکن ہیں۔ ان کی مدد سے اور نئے سانچے کیسے بن سکتے ہیں

3۔ مترجم جس موضوع کا ترجمہ کر رہا ہے اس کی اس موضوع سے مناسب حد تک واقفیت ہونی چاہیے کیوں کہ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی اصطلاح، ایک ہی ترکیب یا ایک ہی لفظ ادب میں کچھ اور معنی رکھتا ہے۔ معاشیات و نفسیات میں دوسرے ہی معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ اس لیے مترجم کو چاہیے کہ وہ صرف اور صرف لغت پر توجہ نہ مرکوز کریں بلکہ خاص موضوع اور سیاق و سباق کی روشنی میں اصطلاحوں اور ترکیبوں کا ترجمہ کریں اور خاص موضوع کی کتاب یا مضمون سے گہری دلچسپی یا اس کے متعلق بنیادی معلومات رکھتے ہوں تبھی اس موضوع کو ترجمہ کے لیے انتخاب کریں۔

ترجمہ کے اصول کیا ہیں اور ترجمہ کس طرح کرنا چاہیے یا ترجمہ کس طرح اور کیسا ہونا چاہیے اس پر ماہرین کی مختلف آرا ہیں۔ اور یہ آرا ایک دوسرے سے کافی مماثل بھی ہیں اور مختلف و متضاد بھی ہیں۔ مثلاً ترجمہ کس طرح ہونا چاہیے یا ترجمہ کس طرح کرنا چاہیے اور قاری ترجمہ کو کس طرح لے یعنی ترجمہ کے بارے میں قاری کا کیا رویہ ہونا چاہیے۔ تھیوڈر ساوری (Theodore Savory) نے The Art of Translation(1959,London) میں بارہ نکات کا ذکر کیا تھا جن سے مترجم پر عائد ذمہ داریوں کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ وہ بارہ نکات درج ذیل ہیں :

1 ۔ ترجمہ میں اصل متن کے الفاظ کا ترجمہ ہونا چاہیے۔

2 ۔ ترجمہ اصل متن کے معانی و مفاہیم پر مشتمل ہونا چاہیے۔

3۔ ترجمہ کو اصل تصنیف کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔

4۔ ترجمہ کو ترجمہ ہی کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔

5۔ ترجمہ میں اصل تصنیف کے اسلوب کی جھلک ہونی چاہیے۔

6۔ ترجمہ کو مترجم کے منفرد اسلوب کا نمائندہ ہونا چاہیے۔

7۔ ترجمہ کو اصل متن کے زمانے تحریر کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔

8 ۔ ترجمہ کو مترجم کے زمانے تحریر کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔

9۔ ترجمہ میں اصل تصنیف سے حذف و اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

10۔ ترجمہ میں اصل متن سے حذف اور اضافہ کبھی ممکن نہیں۔

11 ۔ نظم کا ترجمہ نثر میں ہونا چاہیے۔

12 ۔ نظم کا ترجمہ نظم میں ہونا چاہیے۔

مضمون کا عنوان: **ترجمے کے فنی اور عملی مباحث**	
مضمون نگار: مبصر: سلمان فیصل	**رسالہ کا نام: اردو ریسرچ جرنل**
صفحہ نمبر:76	جلد نمبر: شمارہ نمبر: 07
دورانیہ: سہ ماہی	سنہ اشاعت: جنوری، مارچ 2016
مقام اشاعت: نئی دہلی	مطبع:
ناشر: شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	ایڈیٹر: ڈاکٹر عزیز اسرائیل

ترجمے کے ذریعے مختلف زبانوں کے مابین علوم و ادبیات کے باہمی تبادلہ کا عمل اسی وقت سے ہنوز جاری ہے۔ جب سے الگ الگ زبانوں کے لوگوں کا میل جول عمل میں آیا۔ ترجمہ ایک زبان کے علوم و ادبیات سے دوسری زبان کے لوگوں کو روشناس کرانے کا نام ہے۔ اب اسے باقاعدہ فن کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ ترجمہ کی مختلف جہات ہیں جن کا احاطہ کرنا آسان نہیں۔ فنی حیثیت سے ترجمہ کے بھی اپنے کچھ اصول و ضوابط ہیں ۔ کچھ رہنما ہدایات ہیں ۔ شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ سے یو جی سی ڈی آر ایس مرحلہ دوم کے تحت ایک کتاب ''ترجمے کے فنی اور عملی مباحث'' شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب ان مضامین کا انتخاب ہے جو یو جی سی ڈی آر ایس مرحلہ اول میں '' ترجمے کا فن''سے متعلق مختلف سمینار کے مواقع پر اہل علم نے پیش کیے تھے۔

اس کتاب میں کل ۵ ۲ مضامین شامل کیے گئے ہیں جو مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس کتاب کا پہلا اور سب سے طویل مضمون دیوندر اسر کا ''ترجمہ: فن اور نظریہ'' ہے۔ اس مضمون میں مختلف جہات سے ترجمہ کے اور اس کے نظریات پر مستحکم گفتگو کی گئی ہے، دیوندر اسر نے ترجمے کے فن کا ہر طرح سے مختلف ذیلی عنوانات کے تحت احاطہ کیا ہے۔ مثلاً ترجمے کی نوعیت، لفظی ترجمہ، زبان اور ترجمہ، ترسیل اور ترجمہ، تہذیب اور ترجمہ، شخص اور ترجمہ، ٹیکنالوجی اور آزاد

ترجمہ، اسلوب اور ترجمہ، تخلیقی ادب کا ترجمہ، فکشن کا ترجمہ، شاعری کا ترجمہ، ڈراموں کا ترجمہ وغیرہ جیسے عنوانات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ ترجمے کے نظریات اور رجحانات، اردو میں ترجمے کی روایت، ادبی ترجموں کی روایت، آزاد ترجمے کی روایت اور ان کے مسائل، مترجم کے فرائض اور ترجمے کے لسانی نظریات پر مختلف مضامین شامل ہیں، جن میں ان حوالوں سے مدلل گفتگو کی گئی ہے۔ اسی طرح لغت نویسی، اصطلاحات کا ترجمہ، وضع اصطلاحات اور اصطلاحات کے مسائل اور ان کی صورت حال پر بھی مضامین شامل ہیں۔ ترجمہ اور جامعہ کے ارکان ثلاثہ، سید عابد حسین کی ترجمہ نگاری اور شعر غالب کے انگریزی تراجم اپنی نوعیت کے اہم مضامین ہیں۔ کتاب میں اردو میں قرآن مجید کے ترجمے پر بھی ایک مضمون شامل ہے۔

اس کتاب کی اہمیت وافادیت یوں بھی ہے کہ اس میں شامل تمام مضامین ان اہل قلم حضرات کی تحریر میں ہیں جو اردو زبان وادب کے معاصر منظر نامے کے بڑے اور معتبر نام ہیں۔ اس میں کئی ایسے قلم کار بھی شامل ہیں جو ترجمہ کے فن میں سند کا درجہ رکھتے ہیں اور ترجمہ کے میدان میں مرجع خلائق تصور کیے جاتے ہیں۔ اس کتاب میں تین ایسے مضامین بھی شامل ہیں جو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کئے گئے ہیں اور یہ تینوں مضامین ترجمے کے فن اور اس کے اصول وضوابط کی بہترین مثال بھی ہیں نیز ترجمہ کی زبان ایسی ہے جس پر طبع زارد تحریر کا گمان ہوتا ہے۔ ترجمے کے فن، اس کے نظریات، ترجمے کے مباحث، مسائل اور صورت حال نیز مختلف قسم کے ترجموں پر مبنی یہ ایک اچھی کتاب ہے۔ اس میں شامل تمام مضامین اہم اور اپنی نوعیت کے منفرد اور وقیع ہیں۔ یہ کتاب ترجمے سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے خصوصی طور پر بہترین کتاب ہے۔ ترجمے کے میدان میں نووارد اور طلبہ کے لیے بے حد مفید ہے۔ علمی و ادبی میدان میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی حیثیت ایک روشن اور کشادہ ذہنی رویے کو فروغ دے رہی ہے بانیان جامعہ نے ہمیشہ علم وادب کی آبیاری کی ہے۔ جیسا کہ شروع میں کہا گیا کہ ادبی و علمی سطح پر تبادلہ کا ایک اہم ذریعہ ترجمہ بھی ہے جامعہ میں اس کی روایت شروع سے رہی ہے شعبہ اردو نے یہ کام کرکے نہ صرف اس روایت کا احیا کیا ہے بلکہ بانیان واکابرین جامعہ کو صحیح خراج عقیدت بھی پیش کیا ہے۔

مضمون کا عنوان: **لسانیات اور ترجمہ کے اصول**	
مضمون نگار: ڈاکٹر ابو شہیم خان	**رسالہ کا نام: اردو ریسرچ جرنل**
صفحہ نمبر: 35-29	جلد نمبر: شمارہ نمبر: 17
دورانیہ: سہ ماہی	سنہ اشاعت: جنوری، مارچ 2019
مقام اشاعت: نئی دہلی	مطبع:
ناشر:	ایڈیٹر: ڈاکٹر عزیز اسرائیل

انسانی تاریخ کی ابتداء سے ہی بین لسانی ترسیل کا عمل جاری ہے۔ تین ہزار سال قبل مسیح میسوپوٹامیا میں دو لسانی الفاظ کی فہرست غالباً مترجمین کے لئے ہی تیار کی گئی تھی اور آج ایک ہزار سے زائد زبانوں میں ترجمہ کا عمل جاری ہے۔ اس طویل مدت کے دوران ترجمہ کے بہت سے اصول و نظریات معرض وجود میں آئے ہیں کیوں کہ ترجمہ کے عمل کو اسلوب، منشائے مصنف، لسانی و تہذیبی تنوع، ترسیل مفہوم، متنوع ادبی روایات کے سیاقی تناظر میں دیکھا جاتا ہے جیسا کہ وزکیوز آیور (Vazquez Ayora ـ ـ1977) اور ولس(Wills ـ 1988) وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اس لیے ترجمہ کے کسی ایک اصول یا نظریہ کو حتمی طور پر تسلیم یا تردید نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل نظریہ تجاویز کا جامع اور مبسوط مجموعہ ہوتا ہے جسے کسی واقع یا مظہر کی وضاحت کے لئے بطور کلیہ پیش کیا جاتا ہے لیکن ترجمہ کا کوئی بھی اصول یا نظریہ صرف تجاویز کا مجموعہ نہیں ہو سکتا جس کی پابندی سے مترجم اپنے فرائض کو کامیابی کے ساتھ ادا کر سکے۔۔ مترجمین عموماً جو طریقہ اپناتے ہیں وہ کسی مخصوص تناظر میں ہی اپناتے ہیں۔ ان تناظر کو ہم چار زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(۱) زبان کا تاریخی و تقابلی تناظر، (۲) لسانیاتی تناظر، (۳) ترسیلی تناظر، (۴) سماجی نشانیاتی (لسانی) تناظر

زبان کا تاریخی و تقابلی تناظر: یورپ میں ترجمہ کو زبانوں کے تاریخی و تقابلی تناظر میں دیکھنے کا سلسلہ سسرو، ہورس ،آگسٹائن اور جیروم وغیرہ نے شروع کر دیا تھا۔ان مفکرین کی پوری توجہ یونانی متون کو لاطینی میں بدلنے پر تھی۔جب کہ سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے مترجمین کی پوری توجہ اصل متن سے وفاداری پر تھی خاص کر یورپ کے مترجمین کی ۔کیونکہ اس زمانے میں بائبل کے تراجم اور ان کے طریقہ کار ہی اصول و نظریات کی بنیاد سمجھے جاتے تھے۔اس حوالے سے جو بھی بحثیں ملتی ہیں ان کے مطالعے سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں بحثوں کا محور یہ ہوتا تھا کہ متن قاری کے لیے ہے یا قاری متن کے لیے یعنی کس کو فوقیت دی جائے اور مترجم کو کس قدر آزادی حاصل ہو۔ترجمہ کے اس تناظر کو جن لوگوں نے موضوع بحث بنایا ان میں لوتھر(Luther-1530)انٹائنے ڈولٹ-Etienne Dolet) (1540 کولی(Cowley-1656)ڈرائڈن (Dryden-1680)اور پوپ(Pope-1715) قابل ذکر ہیں۔خاص کر لوتھر جو پہلے مغربی یورپ میں اور پھر دنیا کے دوسرے حصوں میں ہونے والے بائبل کے تراجم پر راست یا بالواسط طور پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوا۔یہ تناظر آج بھی اپنی معنویت رکھتے ہیں۔بہت سے ماہرین فن آج بھی اس سیاق و تناظر میں ترجمہ کرنا اور اسے پڑھنا ترجیح دیتے ہیں۔جیسے کری اینڈ جمپلٹ(Cary & Jumpelt-1963)۔جارج اسٹینر(George Steiner-1975)اور جان فلسٹائنر (John Flestiner-1980) ۔جان فلسٹائنر کی کتاب Neruda Translating غنائی شاعری کے ترجمہ کے مسائل پر بہت ہی اہم کتاب ہے۔اسی طرح یونیورسٹی آف ٹکساس ڈلاس سے شائع ہونے والے رسالے Translation Review کے مضامین اس تناظر کی وکالت کرتے ہیں۔جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ اس تناظر کی پوری توجہ اصل متن سے وفاداری پر ہے۔لیکن بہت سے ایسے مترجمین ہیں جو اس تناظر کی وکالت تو کرتے ہیں لیکن حسب ضرورت اصل متن کے اسلوب، بحر، وزن، مکالمے نا پسندیدہ اور غلیظ تبصروں میں تحریف کے بھی قائل ہیں۔جیسے (اوکٹیو پاز 1971) ۔Octavio paz اور (جارجز ماؤنن 1963) Georges Mounin۔ان دونوں مترجمین نے ادبی فن کاروں کے ترجمہ کے مسائل پر گفتگو کی اور ترجمہ کے اصول و ضوابط کو متعین کرنے میں توازن کو اولیت بخشی۔ان مترجمین کے علاوہ دوسرے مترجمین نے بھی ترجمہ میں وفاداری کے ساتھ ساتھ دوسرے عناصر کو بھی ملحوظ رکھ کر ترجمہ کیا۔(برور 1959) Brower- نے On Translation اور فرالی(Frawley – 1984) نے

میں اصل متن سے وفاداری کے ساتھ لسانیاتی و تہذیبی عوامل کو متعارف کرایا اور مترجمین کو درپیش اہم مسائل کے بارے میں تشفی بخش اور موثر طریقہ کار کی نشاندہی کی۔

لسانیاتی تناظر: ترجمہ میں دو مختلف زبانیں شامل ہوتی ہیں۔اس لئے اہل علم کی ترجمہ کے اس پہلو پر بھی توجہ لازم تھی۔ ابتداً سپیر (Spear) بلوم فیلڈ (Bloomfield) ٹروبٹ اسکوئی (Trubetskoy) اور جیکبسن (Jakobson) نے زبان کے عمل کے منظم مطالعے کی بنیاد رکھی۔ پھر ماہر لسانیات بشریات کے سامی اور ہند یورپی خاندانوں کی زبانوں کے علاوہ دوسری زبانوں کے تجزیہ نے نئے اور تخلیقی انداز میں بین لسانی رشتوں کے مطالعے کو نئے بال و پر عطا کیے۔ نوم چومسکی اور ان کے ساتھیوں نے تقلیب کے ذریعہ زبانوں کے ڈھانچے کے محرک پہلوؤں کا اضافہ کیا۔ یہ تقلیب فن ترجمہ پر بہت سی ایسی کتابوں کی اشاعت کا سبب ہوئی جن کی بنیادی توجہ زبان کے ڈھانچے میں ہم آہنگی اور مماثلت پر تھی۔

اس موضوع پر بہت سے لوگوں نے کتابیں لکھیں لیکن جن کی کتابوں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ان میں ونئے اور ڈار بلنٹ (1958)Darbelnet & Vinay ٹیٹی لون (Tatilon -1986) لارسن (Larson 1984) اور میلون (Malone -1986) شامل ہیں۔ میلون (Malone) کی کتاب کے علاوہ زیادہ تر کتابوں میں ترجمہ کے ان لسانی پہلوؤں پر زور دیا گیا ہے جن میں رسمی اور اصولی نہیں بلکہ بامعنی رشتوں کی وکالت کی گئی ہو۔ لارسن (Larson) کا بھی مطمح نظر یہی ہے لیکن میلون بہت سے ہیتی اور معنیاتی عمل کے لیے غالب تقلیبی رجحان پر زور دیتا ہے اور اس میں تساوی، استبدالی، منفرجی، ارتکازی، توضیحی، تحقیقی، تحلیلی اور تکشیفی عمل بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ عوامل اگرچہ بہت موثر ہیں لیکن ترجمہ کے دوران اصل پیغام یا مواد کو مجروح ہونے سے بچانے کے لئے خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔

ترجمے کے لسانیاتی تجزیے کو بہت سے فلسفیوں نے بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ سچائی، حسن اور خیر کی فلسفیانہ موشگافیوں کے بجائے زبان کے بارے میں فلسفیانہ گفتگو کی ہے۔ ایسے فلسفیوں میں وٹگنسٹائن (Wittgenstien -1953) کیسیرر (Cassirer -1953) گرائس (Grice -1968) کوئن (Quine -1953) رائسور (Ricceur -1969) بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

ان پیش قدمیوں نے اصول/ نظریۂ ترجمہ میں علمیات کے نسبتاً کم احمقانہ انداز نظر کو فروغ دینے کے لئے اہم محرکات فراہم کیا۔ مکالمے میں زبان کے عام استعمال کو سراہا اور فطری زبان پر جھوٹے اعتماد کو غیر اہم قرار دینے میں معاون ہو ۔لیڈمائرل (Ladmiral-1972) نے ترجمہ کے نفسیاتی نکات کو اجاگر کیا اور ان نفسیاتی عوامل کی نشاندہی کی جو لسانیاتی اور تہذیبی عناصر کی ترسیل میں ذہنی رویوں کو متاثر کرتے ہیں اور لیمبرٹ (Lambert-1978) نے متعلقہ زبان کے نشانات سے بولنے والے کی وابستگی کی سطح کی بنیاد پر ذولسانیت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جو مترجمین کے مخصوص امتیازات کو سمجھنے میں کافی معاون ہوا۔

مضمون کا عنوان: منظوم ترجمہ کا فن اور روحانی ادب (درگا سپت شتی اور ارمغان حجاز کے حوالے سے)	
مضمون نگار: ڈاکٹر شباب للت	رسالہ کا نام: آج کل
صفحہ نمبر:20-18	جلد نمبر:69 شمارہ نمبر:06
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: جنوری 2011
مقام اشاعت: نئی دہلی	مطبع: آجکل پبلیکیشنز ڈیوژن، نئی دہلی
ناشر:	ایڈیٹر: ڈاکٹر ابرار رحمانی

اس مضمون میں منظوم ترجمہ کے سلسلے میں کی جانے والی کاوشوں اور اس کی دشواریوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس مضمون میں انہوں نے کالی داس کی مذہبی گرنتھ درگا سپت شتی اور شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اقبال کے ادبی شہ پارہ ارمغان حجاز کا جائزہ لیا ہے۔ یہ دونوں تراجم علامہ بشویشور پرساد منور لکھنوی نے کیے ہیں۔ درگا سپت شتی سنسکرت اشلوکوں پر مشتمل ایک طویل منقبت ہے جو بھگوتی درگا کی توصیف ہے اور ان کے حضور دعائے خیر و برکت کی غرض سے گائی جاتی ہے۔ زیر نظر ترجمے کے 13 باب ہیں اور اس کتاب میں درج مختلف معرکوں کی اور دیوی کی لازوال قوت و شجاعت کی داستانیں ہیں اور مثنوی کی بحر میں ترجمہ کے پیکر میں لائی گئی ہیں۔ ترجمے میں منور کے اشعار کی روانی موسیقیت نفاست محاورہ بندی بندش کی چستی اور مفہوم کی ادائیگی میں دیانت و صفائی اور مجموعی تاثر جہاں قاری کے دل میں عقیدت واردات کو بیدار کرتے ہیں وہیں مترجم کی غیر معمولی فنی اور تخلیقی صلاحیتوں کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔

درگا سپت شتی کا یہ ترجمہ اردو میں واحد منظوم ترجمہ ہے۔ یہ صحت 'مفہوم' صداقت بیاں اور طہارت موضوع کے اعتبار سے کھرا اور پاکیزہ ترجمہ ہے۔ نفس مضمون کی وضاحت میں کہیں لغزش نہیں دکھائی دیتی۔ نہ کہیں سیاق و سباق کا ربط ٹوٹتا

نظر آتا ہے۔ ترجمہ کی سلاست بندش کی چستی حمد و ثنا کے ساتھ مطابقت رکھنے والا طہارت افروز سرمایہ الفاظ، موضوع اور مترنم بحر کا انتخاب، محاورے کی چاشنی اور جاذب لب و لہجہ منور لکھنوی کی مشاقی کے غماز ہیں۔

ارمغان حجاز نہ صرف ایک ادبی شہ پارہ ہے بلکہ اس اعتبار سے اسے ایک روحانی اور مذہبی صحیفہ کہنا بجا ہے کہ یہ دراصل شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اقبال کا ذہنی سفر نامہ حجاز ہے۔ان کے دل میں ایک حسرت برسوں سے پل رہی تھی کہ وہ محبوب الٰہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روزہ مقدس پر خود حاضری دے کر نیاز گزار ہوں مگر عمر کی ڈھلان پر ان کی خرابی صحت اس آرزو کی تکمیل میں سد راہ بن گئی۔ چناچہ انہوں نے اس گنبد خضرا کی جانب یہ سفر ارمغان حجاز کی صورت میں ذہنی طور پر طے کیا۔ منور لکھنوی نے اس فارسی کتاب کو عالم انسانیت اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے ایک پیغام اصلاح و عمل مان کر اس میں شامل فارسی قطعات کو سلیس اردو ترجمے میں ڈھالا اور اسکو سوز اقبال کا نام دیا۔

فارسی زبان کے اس ادب پارے کو اردو کے پیکر میں ڈھال کر سوز قبال اردو دنیا کو پیش کر کے منور نے عالم انسانیت اور اس برصغیر کے اردو دان طبقہ پر احسان کیا ہے۔

مضمون کا عنوان: **جامعہ عثمانیہ اور فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ**	
مضمون نگار: عزیز ابن الحسن	**رسالہ کا نام: اخبار اردو**
صفحہ نمبر:8-6	جلد نمبر: 10 شمارہ نمبر:03
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: مارچ 1993
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: ورڈ میٹ پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	ایڈیٹر: ڈاکٹر انعام الحق جاوید

اس مضمون میں سب سے پہلے جامعہ عثمانیہ میں اردو ذریعہ تعلیم کو اختیار کرنے کا ذکر کرتے ہوئے مستقبل میں ان ہی خطوط پر اردو کو علمی زبان بنانے کی بات کہی گئی ہے۔ مضمون نگار لکھتے ہیں کہ جو دن رات اردو اردو کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں ان کا رویہ ناقابل فہم حد تک پراسرار ہے کیونکہ نفاذ اردو کا مسئلہ ایسا لگتا ہے اب کسی علمی پیچیدگی کا نہیں بلکہ کسی اور ہی مصلحت کا شکار ہے جیسا کہ جتنے تکنیکی اور علمی نوعیت کے مسائل ہو سکتے تھے ان کے حل کے لیے ماضی میں اتنی کامیاب کوششیں ہو چکی ہیں کہ دیانتداری کے ساتھ ان پر شک کی نگاہ تک نہیں ڈالی جاسکتی۔

مضمون میں ایک بین الاقوامی شخصیت ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا کہ انہوں نے ابتداء سے لے کر اعلیٰ ترین درجے تک اردو میں سائنس پڑھی اور بین الاقوامی طور پر نام پیدا کیا۔ مضمون نگار نے کہا کہ جامعہ عثمانیہ میں جو کچھ کام ہو گیا ہے اس کو نظیر بنا کر اگلا کام کیا جائے۔ اس میں ایک مسئلہ اصطلاحات سازی کا ہے تو جامعہ عثمانیہ کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے آگے بڑھا جائے۔ مضمون نگار لکھتے ہیں کہ اردو اصطلاحات کی ترویج کے لئے شعوری کوشش کرنی پڑے گی۔ جب تک اسے عوام میں نہ لایا جائے گا کام نہیں چلے گا اور ہر اصطلاح کو مختصراً صوتی حسن سے آراستہ اور زبان زد عام ہونے کی صلاحیت کا حامل ہونا چاہیے مگر اصل بات اس کے لئے عملی کوششوں کی ہے۔ مشکل سے مشکل اصطلاح کو بھی

کثرت سے استعمال کیا جائے تو وہ عام فہم ہو جاتی ہے اور اس کی اجنبیت اور غرابت دور ہو جاتی ہے۔ جہاں اردو اصطلاح موجود نہ ہو اور مجبوری ہو وہاں انگریزی کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے لیکن حتی المقدور انگریزی استعمال کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے۔

مضمون کا عنوان: ترجمہ اور اس کے اصول و مناہج	
مضمون نگار: ڈاکٹر محمد صلاح الدین عمری علیگڑھ	**رسالہ کا نام: معارف**
صفحہ نمبر:56-42	جلد نمبر:157 شمارہ نمبر:01
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: جنوری1996
مقام اشاعت: اعظم گڑھ	مطبع: معارف پریس، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
ناشر: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	ایڈیٹر: ضیاءالدین اصلاحی

لغت میں ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقلی کو ترجمہ کہتے ہیں ۔ عربی میں اصطلاح کا مطلب ہے کہ زبان کے ایک قالب اور ثقافت کو دوسری زبان کی ثقافت سے متعارف کروانا تاکہ اس میں وسعت پیدا ہو اور وہ عالمی سطح کے علمی و فکری ارتقاء سے خود کو ہم آہنگ کر سکے ۔ ترجمے کا یہی مقصد عباسی دور میں بھی پیش نظر تھا عربی ثقافت کو اس وقت کی عالمی ثقافت اور ان کے علوم و فنون سے متعارف کرایا جائے اور جدید دور میں بھی عربی زبان و ادب اور صحافت کی ارتقاء میں ترجمہ کی تحریک کا بڑا دخل ہے۔

ترجمہ کے اصول و شرائط۔ اصل متن کی زبان اس کے اصولوں، خواہشات، تعبیرات، اصطلاحات، اسرار و رموز، تاریخ، ادبیات اور تاریخ ادبیات نیز اس زبان کے مخصوص قالب اور اس کی تاریخ سے واقفیت مترجم کے لئے اولین شرط ہے ورنہ اسے کسی ادبی و شعری سرمائے کا ترجمہ کرنے کا بیڑہ نہیں اٹھانا چاہیے کیونکہ ہر ادبی تحریر اپنے تہذیبی و ثقافتی ماحول کی عکاسی کرتی ہے، وہ اپنے ادبی و شعری سرمائے سے بھی متاثر ہوتی ہے اور ایسے محاوروں کا بھی استعمال کرتی ہے جن کے معنی اس کی زبان و تہذیب میں پنہاں ہوتے ہیں۔ ترجمہ کرنے والے کی خوبی یہ ہو کہ وہ لسانی نزاکتوں اور باریکیوں کو ترجمہ کی زبان میں اس خوبی اور مہارت سے منتقل کرے کہ ترجمہ پر اصل کا گمان ہو۔

جس زبان میں ترجمہ کرنا ہے اس پر اصل متن کی زبان سے کہیں زیادہ عبور اور قدرت ہونی ضروری ہے کیونکہ ترجمہ کرنے والا ادیب و شاعر کے افکار و نظریات احساسات و جذبات اور معانی و مفاہیم کو ترجمے کی زبان اور اس کے اسلوب میں اسی وقت ڈھال سکتا ہے جب اس کو ترجمے کی زبان پر قابو حاصل ہو نیز ثقافتی ادبی اور لغوی تاریخ تعبیرات اور مترادفات کے مابین نازک فرق کا بھی ادراک رکھتا ہو اور اس زبان کے ادب اور ادبی نزاکتوں کا صاف ستھرا ذوق رکھتا ہو۔ جس موضوع کے متن کا ترجمہ مقصود ہے اس علم کے مبادی سے واقفیت مترجم کے لیے ضروری ہے کیونکہ اکثر موضوعات کے اختلافات سے الفاظ اور اصطلاحات کے معنی و مفہوم بدل جاتے ہیں۔ ابتدائی مرحلے میں سب سے پہلے متن کو غور سے پورا پڑھ لینا ضروری ہوتا ہے تاکہ اس میں زیر بحث مسئلہ کی نوعیت' ترتیبُ افکار کے تسلسلُ جملوں کی مخصوص ساخت اور ترکیب سے واضح ہونے والے مفہومُ انداز بیان سے ابھرنے والے تاثر اور احساسات و جذبات کی مخصوص فضا کو مترجم پوری طرح سمجھ لے۔

اگر ایک بار کا پڑھنا متن کو پوری طرح سمجھنے میں نہ کافی ہو تو بار بار اس کی قرات کرنی چاہیے۔ مفرد الفاظ کے معنی و مفہوم کی تعیین کے بعد جملوں کے معنی اور پھر ایک جملے کو دوسرے جملے سے مربوط کر کے متن سے ابھرنے والے معنی و مفہومُ فکری تسلسل اور ادبی چاشنی کو پا لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اصل متن سے مترجم نے جو کچھ سمجھا ہے اس کو ترجمے کی زبان میں کامیابی سے پیش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مترجم ادیب و شاعر یا مصنف کی روح سے خود کو قریب کرنے کی کوشش کرے۔ ہر دور کی زبانوں کی تراکیب میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے' کچھ نئے الفاظ داخل ہو جاتے ہیں' کچھ متروک ہو جاتے ہیں الفاظ کے معنی میں بھی آسانی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا مترجم کو کسی متن کا ترجمہ کرتے وقت اس دور کی زبان اور اس کے معنی پر بھی نظر رکھنی ضروری ہے جس دور میں وہ متن وجود میں آیا ہے۔ ایک لفظ کے عام طور پر ایک سے زیادہ مفہوم ہوتے ہیں جن کے استعمال کا علم مترجم کو بخوبی ہونا چاہیے۔

مضمون کا عنوان: **انگریزی زبان کے مترادفات اور مرادفات کا ترجمہ اور مسائل**	
مضمون نگار: مسعود احمد چیمہ	**رسالہ کا نام: اخبار اردو**
صفحہ نمبر:9-7	جلد نمبر:03 شمارہ نمبر:05
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: مئی1986
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: برق پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	ایڈیٹر: شریف کنجاھی

مضمون نگار کا کہنا ہے کہ مترجمین کے لئے انگریزی زبان کے مترادفات سب سے زیادہ مشکلات کا باعث ہوتے ہیں اور یہ ان کا اپنا ذاتی تجربہ ہے جو گزشتہ 2 سال میں بے شمار دفتری فارموں اور قواعد وضوابط کے ترجمہ کے دوران انہیں حاصل ہوا ہے۔ انگریزی زبان میں ہمیں ایک ہی مفہوم رکھنے والے یا قریب قریب ایک ہی مفہوم رکھنے والے الفاظ سے قدم قدم پر واسطہ پڑتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی بذات خود مترادفات کی زبان ہے۔ شاہ الفریڈ کے زمانے میں انگریزی لفظ Hero کے لئے 37 مترادفات موجود تھے اور لفظ Ship کے لیے 27 مترادفات تھے۔

مترادفات کسی زبان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافے کا باعث ہوتے ہیں اور اس سے بیان میں حسن پیدا کیا جاسکتا ہے تاہم صحیح مقام پر صحیح لفظ کے استعمال کے سلسلے میں مکمل احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ کیوں کہ ان مترادفات میں باریک سا فرق ضرور موجود ہوتا ہے جس کو پیش نظر رکھنا مترجم کے لئے ضروری ہے۔ اس کے بعد مضمون نگار نے چند الفاظ کی ایک فہرست دی ہے جو ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں لیکن اردو میں ہر ایک کیلئے ایک الگ لفظ موجود ہے۔ مضمون نگار کہتے ہیں کہ ایک اچھا مترجم وہی ہے جو موقعے کی مناسبت سے موضوع ترین الفاظ کا انتخاب کرے۔ اس کے کام میں عمدگی صرف اسی

صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ اس کا مطالعہ وسیع ہو اور جس موضوع سے متعلق دستاویز کا ترجمہ کرنے کے لئے بیٹھے اس کی مبادیات سے واقف ہو۔

یہ بھی ضروری ہے کہ مختلف لغات مترجم کے زیر مطالعہ رہیں جن سے وہ اپنی ضرورت کے مطابق الفاظ کا انتخاب کر سکے۔ لغت دیکھنے کو شان کے خلاف سمجھنا بڑی سنگین غلطی ہے بلکہ لغت سے تو خوب کام لینا چاہیے۔ جس طرح میدان جنگ میں سپاہی کے پاس ہتھیار کا ہونا ضروری ہے اسی طرح ایک اچھے مترجم کے پاس ہر اہم لغت کا موجود ہونا ضروری ہے ورنہ وہ اپنے کام سے انصاف نہیں کر سکے گا۔ موقع محل کے مطابق موزوں الفاظ کا انتخاب مترجم کا فرض عین ہے ورنہ اس کی کامیابی مشکوک ہو جائے گی ۔ اردو ایسی بھی بے مایا نہیں ہے کہ علمی ترجمہ ہمارا ساتھ نہ دے سکے صرف دیکھنے والی آنکھ کی ضرورت ہے۔ دفتری قواعد و ضوابط اور ترجمہ کے لیے ہمیں ہر اصطلاح کو اس کے مخصوص پس منظر کے ساتھ دیکھنا ہو گا ورنہ ہمارا کام معیاری نہیں ہو گا۔

مضمون کا عنوان: اصطلاحات فہمی	
مضمون نگار: عابد معز	**رسالہ کا نام: اردو دنیا**
صفحہ نمبر: 13-10	جلد نمبر: 19 شمارہ نمبر: 09
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: ستمبر 2017
مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل، نئی دہلی	مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا، انڈسٹریل ایریا، فیز۔II، نئی دہلی۔110020
ناشر: ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند۔	ایڈیٹر: پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

اس مضمون میں مضمون نگار نے سب سے پہلے اصطلاح کی تعریف' اس کے بعد اصطلاحوں کی اہمیت اور پھر اصطلاحات فہمی اور اس کی اقسام اور استعمال پر گفتگو کی ہے۔

سائنس حقائق، اصول و تصورات اور اختراعی خیالات کا علم ہے۔ سائنس میں ہر دم نئے حقائق، تصورات اور خیالات دریافت ہوتے رہتے ہیں جس کے سبب نئی نئی اصطلاحات وضع ہوتی رہتی ہیں۔ سائنس میں اصطلاحات وضع ہونا ایک مستقل اور مسلسل عمل ہے۔ کسی بھی زبان میں اصطلاحات کے ذریعے سائنس کی درس وتدریس اور لوگوں میں سائنس کی تفہیم آسان ہوتی ہے اس لئے کسی بھی زبان میں سائنس کی تعلیم اور اس کے بولنے والوں میں سائنس فہمی کے لیے اصطلاحات وضع کرنا ضروری ہوتا ہے۔

جس زبان میں جتنی آسان اور عام فہم اصطلاحات ہوں گی اس میں سائنس اور جدید علوم کی ترسیل بھی آسان ہوتی ہے اسی طرح جس زبان میں جتنی زیادہ اصطلاحیں ہوں گی اس زبان میں سائنس اور دیگر علوم کا ذخیرہ اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ انگریزی زبان میں سب سے زیادہ اصطلاحوں کا ذخیرہ ہے یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کے بیشتر علاقوں میں سائنس مادری زبان میں پڑھنے کے بجائے انگریزی زبان میں سیکھی جارہی ہے اس لیے عالمی سطح پر انگریزی سائنس اور ٹیکنالوجی کی زبان بن گئی ہے۔

سائنس کی بہتر سمجھ اور انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ کرنے کے لئے انگریزی میں اصطلاح سازی سے متعلق حساس معلومات حاصل کرنا ضروری ہے کیونکہ اس عمل سے اردو زبان میں اصطلاحات وضع کرنے میں بھی مدد مل سکتی ہے۔ جب کوئی نئی تحقیق ہوتی ہے یا کوئی نکتہ سامنے آتا ہے تو اسے بیان کرنے کے لیے اصطلاح بنانا پڑتا ہے اور وضع اصطلاح میں سب سے اہم کردار مصدر ادا کرتا ہے جو اصطلاحوں کی بنیاد بنتا ہے اور وہ عموماً اصطلاح کا مرکزی حصہ ہوتا ہے۔ بعض اصطلاحیں دو یا زیادہ الفاظ کو ملا کر بنائی جاتی ہیں انہیں مرکب الفاظ کا نام دیا جاتا ہے جن سے نکلنے والا مطلب ایک دوسرے سے مربوط ہوتا ہے۔

انگریزی اصطلاحات میں سابقوں اور لاحقوں کا بھی استعمال ہوتا ہے۔ سابقے عموماً تعداد، مقام، وقت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سائنس لفظوں کی بازی گری بھی ہے۔ لفظوں سے صرف ادب ہی میں نہیں کھیلا جاتا بلکہ ادب سے زیادہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں لفظوں کی ہیرا پھیری سے معنی اور مفہوم بدلے جاتے ہیں۔ بعض ماہرین نے انگریزی اصطلاحوں کو آسانی سے سمجھنے کا طریقہ بتایا ہے ان کے مطابق سب سے پہلے اصطلاح کے اجزاء واضح کر لیے جائیں، پتہ لگانے کی کوشش کریں کہ اصطلاح کتنے اجزا سے بنی ہیں ۔ کسی اصطلاح کے اجزا کو مصدر، سابقہ، لاحقہ ملانے والی حرف علت میں تقسیم کر کے دیکھا جاسکتا ہے۔ اصطلاح فہمی کے دوسرے مرحلے میں لاحقے کے معنی معلوم کریں اس کے بعد سابقہ مفہوم پر غور کریں سب سے آخر میں مصدر کو دیکھنا چاہئے۔ لاحقہ اور سابقہ کے تناظر میں اصطلاح کے معنی اور مفہوم واضح ہوتے ہیں ان اجزاء کو ملانے والے حروف کا بھی نوٹ لینا چاہیے۔ اس طریقے پر عمل پیرا ہونے کے باوجود مشکل اور نئے الفاظ کے معنی اور مفہوم جاننے کے لیے لغت یا فرہنگ کی مدد ضروری ہوتی ہے۔

مضمون کا عنوان: **اصطلاحات کا مکتب فکر**	
مضمون نگار: ڈاکٹر عطش درانی	**رسالہ کا نام: اخبار اردو**
صفحہ نمبر:14-13	جلد نمبر:09 شمارہ نمبر:12
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: دسمبر1992
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: ورڈ میٹ پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	ایڈیٹر: ڈاکٹر انعام الحق جاوید

دور جدید میں علمی اصطلاح کے بانی ای وو سسٹر نے اس امر پر زور دیا ہے کہ اصطلاحات سازی کا منظم کام ماہرین اصطلاحات کا دائرہ کار ہے جو دراصل ماہرین مضمون ہوتے ہیں اور اضافی طور پر اصطلاحات میں تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ اردو جیسی زبانوں میں اصطلاحات سازی کا عمل چونکہ زیادہ ترجمے پر مشتمل ہوتا ہے اس لیے ترجمہ کاری کا عمل بھی وضع اصطلاحات میں شریک ہو جاتا ہے جو تین لوازمات سے واقفیت کے بعد ہی انجام پاتا ہے۔ ایک مہارت مضمون، دوسرے عمل اصطلاح میں تربیت اور تیسرے فن ترجمہ سے آگاہی۔ اردو اصطلاح کا جدید مکتب فکر اسی بنیاد پر استوار ہوتا ہے۔ نئے عالمی نظام میں یہ امر خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اصطلاح کے لئے صرف معین لفظ استعمال کیا جائے نیز مترادفات سے گریز کیا جائے۔ ان تصورات کی روشنی میں اردو میں اصطلاحات سازی کا پورا تصور رائج نہیں ہوا۔ اردو میں لسانی اور قواعدی بنیادوں پر تو کام ہوا لیکن جدید اصطلاح نظام و کئی میدانوں میں ابھی ہم داخل نہیں ہو سکے۔ ابھی ہمارے پاس اس ادبیات و لسانیات " لفظ سازی کا مکتبہ فکر "ہی کام کر رہا ہے۔ اس مکتب فکر کے خلاف پہلی آواز ہمیں حیدر آباد دکن ہی میں ملتی ہے۔ یہ چوہدری برکت علی تھے جن کے نزدیک اصطلاح سازی لفظ سازی سے الگ عمل ہے تاہم وہ عملی طور پر لفظ سازی تک ہی محدود رہے جبکہ وحید الدین سلیم تو سرے سے قرارداد معانی کے مخالف اور لفظ سازی کے قائل تھے، وہ بھی لفظ سازی کے چکر میں الجھے رہے۔ اردو اصطلاحات سازی کے پس منظر میں یہ خیال مغالطے کی حد تک عام ہے کہ اصطلاحیں خود بخود بنتی اور چلن پاتی ہیں اور کوئی اصطلاح زبردستی مسلط نہیں کی جا سکتی۔

اردو میں علم اصطلاح کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ ایسے مذاکرہ سیمینار ورکشاپ اور کورس منعقد کیے جائیں جن میں اردو اصطلاحات سازی کا عملی مطالعہ ہو سکے ۔انگریزی اصطلاحات کی نوعیت کو سمجھا جائے اور ان کے مطابق نیز اپنی ضروریات کے لئے اردو کی صلاحیت سے استفادہ کرتے ہوئے اردو میں اصطلاحات سازی کی جائے اور یہ سارا کام انگریزی کی سائنسی اور علمی اکادمیوں کی طرح مجالس استناد کی معیار بندی کے بعد شائع کیا جائے۔اگر اردو زبان کو اصطلاح سازی کے میدان میں آگے بڑھانا ہے تو یقیناً اسے محض ترجمے میں لفظ سازی اور لسانیاتی وادبیاتی بنیادوں سے ہٹا کر تسمیہ اور وضع اصطلاحات اور تصوریاتی حوالے سے قرارداد معنی کی بنیاد پر استوار کرنا ہوگا۔اس مقصد کے لیے کمپیوٹر کی مدد بھی حاصل کرنا پڑے گی اور ماہرین مضمون ہی پر اکتفا بھی کرنا پڑے گا۔ہر مضمون کی اصطلاح اسی مضمون کے ماہرین سے وضع کرانی ہو گی ،شرط صرف علمی اصطلاحات سے ان کے گہرے ادراک کی ہو گی۔

اسی سے اردو اصطلاحات سازی میں ایک نئے مکتب فکر کی بنیاد پڑے گی جسے "اصطلاحیات کا مکتب فکر" کہا جاسکتا ہے۔یہ مکتبہ فکر زبان کو ادبیات سے زیادہ معنویات کے دائرے میں لانے کی تعلیم دیتا ہے۔اس میں بنیادی طور پر روزمرہ اور ادبی زبان سے گریز کرنے اور مخصوص علمی زبان اختیار کرنے کی تعلیم دی جائے گی۔اس میں عبارت آرائی سے بھی گریز کیا جاتا ہے اور اس کا اسلوب مجازی سے زیادہ تکنیکی ہوتا ہے۔یہ مکتب فکر اصطلاحات کو دو اقسام میں تقسیم کرتا ہے ایک عمومیاتی اور دوسرا اماہراتی۔اصطلاحی ترجمہ میں دوسری قسم ماہراتی کو ترجیح دی جاتی ہے اور پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ضروری ہے کہ اردو میں اصطلاحیات کے بنیادی اصولوں کو پیش کیا جائے انہیں فروغ دیا جائے اور ان کے مطابق تربیت اور تدریس کا اہتمام کیا جائے تاکہ ترقی زبان کا یہ مرحلہ بخوبی طے ہوں اور اردو زبان نئی منزلوں کی جانب بڑھ سکے۔

مضمون کا عنوان: **ترجمہ نگاری :چند پہلو**	
مضمون نگار: احمد سہیل	**رسالہ کا نام: شاعر**
صفحہ نمبر:47-44	جلد نمبر:80 شمارہ نمبر:01
دورانیہ:ماہنامہ	سنہ اشاعت: جنوری2009
مقام اشاعت: ممبئ	مطبع:
ناشر:	ایڈیٹر: افتخار امام صدیقی

اردو کے ادبی نظریات کی تاریخی تناظر میں جب بھی بحث شروع ہوتی ہے تو ابتداء اردو تراجم سے ہی ہوتی ہے کیونکہ اردو کے ابتدائی تراجم اور ان کے ماخذات سے ہی اردو کی ادبی تاریخ کا ایک مکمل "کل" کے ساتھ اور ترتیب وار تناظر میں مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ترجمہ فکر کے نئے دروازے کھولتے ہوئے ایک تمدن کو دوسرے تمدن کے اقدار و نظریات سے متعارف کرواتا ہے جس میں تین لسانی رویے شناخت کئے جاسکتے ہیں۔ 1۔زبان کا ماخذ 2۔زبان کا ہدف 3 ۔نفس مضمون۔

مترجم انہیں تین نکات کی بنیاد پر دیے ہوئے متن میں پوشیدہ لسانی معنویت کو آشکار کرتا ہے جو بہت سوں کی نظر میں تخلیق نو ہوتی ہے اس سے زبان کا ہدف اور ماخذات تو ابھرتے ہیں اور ساتھ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ زبان کی ہدف کی ساخت بگڑ گئی ہے۔ دراصل یہ ہدف یافتہ زبان کی تبدیلیوں کو رموزیات کے ساتھ متن میں موجود پیغامات کو ایک ثقافتی فضا سے باہر نکال کر دوسری ثقافتی فضا میں رکھ دیتے ہیں مگر ترجمہ کی زبان میں اس وقت تک "عالمی معروض" کی آمیزش نہیں ہوتی جب تک اس کی تفہیم ترجمہ کرنے والی دوسری زبان کی ثقافت کے شعور کا حصہ نہ بنے لیکن ترجمہ زبان کے جبر سے کبھی چھٹکارا حاصل نہیں کرتا۔ مثلاً کسی تحریر کا ایک زبان میں ترجمہ ہو کر دوبارہ پھر اسی زبان میں ترجمہ ہوتا ہے جس کو ترجمہ در ترجمہ کا عمل بھی کہا جاتا ہے۔

تراجم کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ ہی ادب کی تہذیب و تمدن کے ارتقا اور رسائیوں کا کھوج لگانے میں مدد دیتا ہے اور تراجم کے نظریاتی ،منہاجاتی اور مابعد نظریات احاطے میں لاتے ہوئے ترسیلی، تسلیماتی، تفہیماتی ،فتیشی،اسطوری اور علمیاتی اصناف وغیرہ کی تشریح کرتا ہے۔

تراجم کے نظریات میں تین عناصر اہم ہوتے ہیں کیونکہ یہی عناصر تراجم میں اپنی موجودگی کا احساس دلواتے ہیں مگر پھر بھی تراجم کے میدان میں یہ مسئلہ ہمیشہ رہتا ہے کہ اس میں ابہام اور تشکیک کا تناسب بھی خاصہ ہوتا ہے جو اصل تخلیقی معروض سے انکار کا سبب بھی بن جاتا ہے۔ترجمے کا اصل مسئلہ ابلاغ کا بھی ہے جس میں لسان و زبان کی منتقلی سے ترجمہ کا عمل شروع ہوتا ہے یعنی ترجمے میں اصل ہدف ایک طرف تو اقدار کی منتقلی بھی دکھائی دیتی ہے اور قاری اپنی حیثیت سے نئی جمالیات بھی تشکیل دیتا ہے اور اصل لکھاری تخلیق کے متن کو بھی تاثراتی فضا میں بھی لے جاتا ہے۔مترجم کا متن سے قلبی اور ذہنی لگاؤ ہونا ضروری ہے۔ساتھ ہی مترجم کو اس ذمہ داری کا بھی احساس ہونا چاہیے کہ وہ متن کی اصل حرکیات جمالیات اور ماخذات سے شعوری تعلق رکھے۔ساتھ ہی ترجمہ کرنے والے کو متن سے معاملہ بندی کرنا بھی آنا چاہیے۔

مضمون کا عنوان: اصطلاحات سازی کے منصوبوں کا تجزیہ	
مضمون نگار: ڈاکٹر عطش درانی	**رسالہ کا نام: اخبار اردو**
صفحہ نمبر: 22-20	جلد نمبر: 11 شمارہ نمبر: 11
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: نومبر 1994
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: ورڈ میٹ پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	ایڈیٹر: ڈاکٹر انعام الحق جاوید

یہ مضمون دراصل فن لینڈ میں واقع سینٹر برائے تکنیکی اصطلاحات میں جاری تحقیق کا ایک جائزہ ہے جس کا ترجمہ ڈاکٹر عطش درّانی نے کیا ہے۔ اس سینٹر کا بنیادی مقصد ٹیکنالوجی اور انجینئرنگ کے میدانوں میں فنّیش اور سویڈش زبانوں میں اصطلاحی اصولوں کے مطابق ذخیرہ الفاظ اور فرہنگیں تیار کرنا ہے۔ ننانوے میں اس مرکز پر اصطلاحی منصوبوں کی لاگت کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا۔ یہ مضمون اسی جائزے کی مختصر سی رپورٹ ہے۔

ایسے منصوبوں کو جن میں اصطلاحی اصول اور طریقہ کار استعمال کیا جاتا ہے پانچ مرحلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1۔ منصوبہ بندی

2۔ فرد اصطلاحات

3۔ تجزیہ تصورات و تعریفات

4۔ اصطلاحی متبادلات کی تلاش

5۔ حتمی نظر

کسی بھی مضمون کے میدان میں ماہرین مضمون اور ماہرین اصطلاحات دونوں کی مساوی خدمات کی ضرورت ہوتی ہے۔ روایتی طور پر بہت سا اصطلاحی کام کمیٹی کے اجلاس میں انجام پاتا ہے۔ ماہر اصطلاحات، ماہرین کے ساتھ ذاتی روابط کی بناپر بہت سا مواد حاصل کر کے کام کرتا ہے۔

تجزیے کے لیے نو اصطلاحی منصوبے میں اپنی تفصیلات اور دستاویزات منتخب کیے گئے۔ ان میں سے ایک میں روایتی طریقہ کار ہے۔ اور تین میں ماہرین اصطلاحات کام کرتے رہے ہیں۔ پانچ منصوبوں میں عمومی ماہرین کو مرکزی حیثیت حاصل ہے جبکہ چار میں ماہر اصطلاحات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ مختلف پیمانوں پر ان منصوبوں کا تجزیہ کیا گیا۔ تجزیہ کے بعد تین طرح کے نتائج برآمد ہوئے۔ منصوبے سے متعلق نتائج، تقابلی نتائج اور عمومی نتائج۔ تقابلی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ روایتی مجلسی طریقہ کار، ماہر اصطلاحات مرکزی طریقہ کار سے دوگنا مہنگا ہے اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ اس طریقہ کار میں اجلاسوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ روایتی مجلسی طریقہ کار میں اجلاسوں کی تعداد جتنی بڑھے گی منصوبے میں تکمیلی مدت میں اتنا ہی اضافہ ہو گا۔

اس تجزیہ کا حاصل یہ رہا کہ ایسا اصطلاحی منصوبہ جس میں ماہر اصطلاحات بنیادی کردار ادا کر رہا ہے، روایتی مجلسی طریقے کی نسبت زیادہ مؤثر ٹھہرتا ہے۔ کسی منصوبے میں ماہر اصطلاحات کا کام بڑھانے کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ کام کا کل وقت حتی کہ ماہر اصطلاحات کا کل وقت بڑھا دیا جائے۔ بلکہ دیگر ماہرین کے کام کا وقت کم کر دیا جائے گا اور یہ وقت ماہر اصطلاحات کے وقت میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ ایک مناسب طریقہ کار کی وجہ سے کام کی لاگت اور وقت دونوں کم ہو سکتے ہیں۔ اس کا بنیادی اصول بہت سادہ ہے کہ ماہر اصطلاحات اور ماہر مضمون کو اپنی مہارتوں پر توجہ مرکوز کرنے دیجئے۔ یہ اندازہ بھی لگایا گیا ہے کہ ماہر اصطلاحات کا کیا ہوا کام بعض منصوبوں میں روایتی طریقہ کار کے ہم پلہ اور بعض میں بہتر ثابت ہوا ہے۔ فنش مرکز نے ان نتائج کو اپنے کاموں میں کئی انداز سے استعمال کیا ہے۔ اول یہ کہ مرکز کے اصطلاحی منصوبوں میں اب ماہر اصطلاحات مرکزی طریقہ کار کو اپنایا جانے لگا ہے۔ دوسرے یہ کہ نئے اصطلاحی منصوبے لاگتی تجزیے کی بناپر تیار کیے جانے

لگے ہیں۔ تیسرے یہ کہ اب کسی بھی منصوبے کی لاگت کو اختتام سے قبل کنٹرول کیا جا سکتا ہے چنانچہ یہ مطالعہ اس مرکز کے لیے بے حد سود مند ثابت ہوا ہے۔

مضمون کا عنوان: **اردو میں دفتری اصطلاحات کا منظر نامہ**	
مضمون نگار: ڈاکٹر عطش درانی	**رسالہ کا نام: اخبار اردو**
صفحہ نمبر:20-17	جلد نمبر: 10 شمارہ نمبر:07
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: جولائی 1993
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: ورڈ میٹ پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	ایڈیٹر: ڈاکٹر انعام الحق جاوید

اس مضمون میں برصغیر میں دفتری اصطلاحات کا آغاز، اس کے ماخذ زبانوں کی ترتیب اور اس کے ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے۔ برصغیر میں دفتری اصطلاحات کا آغاز دور سلاطین میں ہو گیا تھا۔ان کی ماخذ زبانوں کی ترتیب عربی، فارسی، مقامی اور انگریزی ہے۔آٹھویں سے سولہویں صدی عیسوی تک دنیائے اسلام کی مختلف ریاستوں میں انتظامی ڈھانچے اور تنظیم کی مختلف صورتیں ارتقاء پذیر ہوئیں۔اس تاریخی سرمائے میں انتظامی اصطلاحات کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ برصغیر میں ان موضوعات پر وضع اصطلاحات اور انہیں مرتب کرنے کا کام مغلیہ عہد میں ہوا۔عوام چونکہ ہندی، ہندوستانی، اردو اور دیگر مقامی زبانیں بولتے تھے اس لیے برصغیر کی مقامی زبانوں کا اصطلاحات سازی پر اثر پڑنا لازمی تھا لیکن ان کی تدوین فارسی میں کی گئی جو مغل دربار کی زبان تھی۔ شاہ جہاں کے دور میں اردو دفتروں میں استعمال ہوتی تھی۔دکن کی عادل شاہی سلطنت میں تو اردو کے بطور دفتری زبان استعمال کا علم اکبر کے دور سے بھی پہلے ہوتا ہے۔

اس کے بعد مضمون نگار نے مختلف انتظامی اصطلاحات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔بعد ازاں پاکستان میں دفتری موضوعات پر فرہنگوں کی اشاعت کے حوالے سے تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور کہا گیا کے یہ کام مکتبہ نوائے وقت، مقتدرہ اور مجلس زبان

دفتری میں انجام پایا۔ حکومت کے فیصلے کے مطابق ہر محکمے میں استعمال ہونے والی اصطلاحات اور محاورات پر مشتمل کتابچے شائع کیے گئے۔

پاکستان میں دفتری اصطلاحات پر نہ صرف بہت زیادہ کام ہوا بلکہ اس پر ماہرین نے خاصے غور و فکر سے بھی کام لیا ہے اور ان لغات کے بعض اقسام بھی سامنے آئے ہیں۔ دفتری اصطلاحات میں مشکلات کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ان میں مغلیہ دور کے رائج الوقت نظام کی باقیات ہی متداول رہیں جو فارسی کا سرمایا خاص تھیں لیکن انگریزی کی گرفت جیسے جیسے بڑھتی گئی انگریزی اصطلاحات بھی زیادہ ہوتی گئیں۔ دفتری اصطلاحات کے بعض تراجم رفتہ رفتہ متروک ہوتے چلے گئے ہیں لیکن لغات میں اب بھی انہیں رکھنے پر اصرار کیا جاتا ہے۔ ایک اور مسئلہ جو دفتری اصطلاحات میں درپیش ہے وہ مفہوم کے لحاظ سے اردو مترادفات کے تعین کا ہے۔ ضروری ہے کہ اردو میں مفاہیم کے تعین کے لحاظ سے الفاظ مقرر کیے جائیں بصورت دیگر تعین مفہوم کا کام استعمال الفاظ و اصطلاحات کی بنیاد پر از خود ہونے لگے گا۔

مضمون کا عنوان: **اردو میں تعلیمی اصطلاحات**	
مضمون نگار: ڈاکٹر عطش درانی	**رسالہ کا نام: اخبار اردو**
صفحہ نمبر:12-10	جلد نمبر:10 شمارہ نمبر:03
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: مارچ، 1993
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: ورڈ میٹ پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	ایڈیٹر: ڈاکٹر انعام الحق جاوید

سماجی علوم میں تعلیمی علوم ہی وہ میدان واحد ہے جسے تحقیق وذریعہ تعلیم کے حوالے سے اصطلاحات سازی میں بہت آگے اور مکمل ہونا چاہیے تھا لیکن اسی میدان میں بہت دیر سے اور بہت کم اصطلاحی کام ہوا ہے۔ تاریخی حوالے سے اردو میں تعلیمی اصطلاحات سازی کے عمل کو پون صدی بھی مکمل نہیں ہوئی۔ اس کا آغاز پنجاب سے ہوا جہاں انجمن پنجاب کی تحریک پر پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے 1928ء میں مختلف علوم کی الگ الگ اصطلاحی فہرستیں ایک مجموعہ کی صورت میں اردو اصطلاحات کے نام سے لاہور سے شائع کیں۔ اس میں اصطلاحات سازی کا رجحان عربی زبان کی طرف زیادہ تھا۔ تعلیمی اصطلاحات نگاری کی دوسری بڑی کوشش انیسویں صدی کے نصف اول ہی میں کہیں سامنے آئی۔ اگرچہ جامعہ عثمانیہ میں اصطلاحات سازی کا کام بڑے پیمانے پر ہوا لیکن علم التعلیم سے متعلق اصطلاحات پر توجہ نہ دی گئی۔

البتہ حیدرآباد دکن ہی کے عثمانیہ ٹریننگ کالج سے پہلا ایسا لغت" مجموعہ اصطلاحات تدریسیات" 1946 میں شائع ہوا۔ 1991 میں اسے اردو سائنس بورڈ نے 'فرہنگ درسیات" کے نام سے عکسی طور پر شائع کر دیا ہے اس لغت میں اصطلاحات سازی کے لیے عربی پر زیادہ انحصار کیا ہے تاہم فارسی تراکیب کو بھی استعمال کیا گیا ہے۔ عثمانیہ ٹریننگ کالج ہی کی طرف سے تعلیمی کتب کا ایک سلسلہ تراجم شروع ہوا جن میں اکثر کتب میں اصطلاحی اشاریہ اور فرہنگیں بھی شامل کی

گئیں۔ اس کے بعد فاضل مضمون نگار نے ان فرہنگوں کا تعارف کروایا ہے جو 1950 سے 1990 تک کے درمیان شائع ہوئیں۔ آخر میں مضمون نگار کا کہنا ہے کہ تعلیمی علوم میں اصطلاحات نگاری اور لغات سازی کا بنیادی کام پنجاب اور حیدر آباد دکن ہی میں ہوا۔

مقتدرہ کا کام حیدر آباد دکن کی اصطلاحات سے ضخامت اور مقدار میں زیادہ اور جامعیت میں قابل قدر ہے۔ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان تمام لغات کو یکجاء کر کے اصطلاحی معیار بندی کا کام انجام دیا جائے جواب بھی ضروری ہے۔ نیز ابتداء سے کشاف اصطلاحات تعلیم کی ضرورت ہے جو اصطلاحات کے ساتھ ساتھ اردو تصورات اور مفاہیم کے اسالیب متعین کر سکے۔

مضمون کا عنوان: **شعر غالب کے انگریزی تراجم**	
مضمون نگار: ڈاکٹر کوثر مظہری	**رسالہ کا نام: آجکل**
صفحہ نمبر:10-6	جلد نمبر:68 شمارہ نمبر:07
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: فروری،2010
مقام اشاعت: نئی دہلی	مطبع: آجکل پبلیکیشنز ڈیوژن، نئی دہلی
ناشر:	ایڈیٹر: ڈاکٹر ابرار رحمانی

اس مضمون میں شاعری میں تہذیبی سیاق اور اس تہذیبی سیاق کے ترجمے کے دوران آنے والی دشواریوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مضمون نگار لکھتے ہیں کہ دنیا کی تمام زبانیں اپنا تہذیبی سیاق رکھتی ہیں اور اردو بھی اس سے مبرا نہیں ہے۔ اردو کا اپنا ایک تہذیبی سیاق اور مزاج ہے۔ فن ترجمہ نگاری میں ادبی ترجمہ ایک مشکل امر ہے اور شاعری کا ترجمہ تو اور بھی مشکل۔ تاہم شاعری کے ترجمے کی کوشش اس کے باوجود بھی ہوتی رہی ہے جس کے پیچھے ایک پر خلوص جذبہ کار فرما ہوتا ہے اور وہ جذبہ ہے تہذیبی، ثقافتی، علمی اور ادبی لین دین کا۔

غالب اردو کے بڑے اور مقبول ترین شاعروں میں سے ایک ہیں اور ان کی طرز ادا اور مضمون عالی اور ندرت خیال کے سبب ان کی شاعری کے ترجمے کی ہمیشہ سے کوششیں کی جاتی رہی ہیں اور ان ترجموں میں ملنے والے تضادات دراصل غالب کے مختلف اظہار خیال کو ظاہر کرتے ہیں۔ مضمون نگار لکھتے ہیں کہ سردار جعفری اور قرۃ العین حیدر نے 92 صفحات پر مشتمل ایک کتاب Ghalib and his poetry لکھی اس میں سردار جعفری لکھتے ہیں کہ غزل کے اصل معنی کی تلاش ایک دشوار کن امر ہے۔

اس کے بعد مضمون نگار نے غالب کے چند اردو اشعار اور ان کے تراجم کی مثالیں دے کر ان دشواریوں کی وضاحت کی ہے جو اردو کے تہذیبی سیاق کی بنا پر مترجم کو پیش آتے ہیں۔

مثلاً غالب کا یہ شعر

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے

آخر اس درد کی دوا کیا ہے

مضمون نگار نے کہا کہ میرے خیال میں بڑے سے بڑا ترجمہ نگار بھی اس شعر کے Unsaid meaning کو اور ماورائے شعر کو پیش کرنے میں ناکام رہے گا۔ یوسف حسین نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

O simple heart, what has befallen thee?

What remedy can there be for thy pain?

دل ناداں کہنے میں جو بات ہے وہ Simple heart میں نہیں ہے۔ پھر یہ شاعر نے اس درد کی دوا کیا ہے جو بیزاری اور اکتاہٹ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے وہ ترجمے میں موجود نہیں۔ شاعر نے تیرے درد کی بات نہیں کی بلکہ 'آخر اس درد' کہا ہے۔

اس کے بعد آخر میں مضمون نگار نے مترجمین کی غالب کی شاعری کے ترجموں کی ان کاوشوں کو سراہا ہے اور لکھا ہے کہ ترجمہ نگاری کو Thankless job کہا گیا ہے تاہم ترجمہ نگار اپنی محنت اور صلاحیت سے ہی یہ کام انجام دیتا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے غالب کی شاعری کے تراجم کے تقابلی مطالعے پر بھی زور دیا۔

مضمون کا عنوان: نیر مسعود کے فارسی افسانوں کے تراجم کا تنقیدی جائزہ	
مضمون نگار: سید حسن سردار	**رسالہ کا نام: فیضانِ ادب**
صفحہ نمبر:311-302	جلد نمبر:03 شمارہ نمبر: 2,3,4
دورانیہ: سہ ماہی	سنہ اشاعت: اپریل تا دسمبر 2018
مقام اشاعت: مئو، یوپی	مطبع:
ناشر: ادارہ تحقیقات اردو و فارسی، پورہ معروف، مئو یوپی۔	ایڈیٹر: فیضان حیدر

اس مضمون میں ادبی اور تخلیقی تراجم کی دیگر تراجم کے مقابلے اہمیت اور ان کے مقام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مضمون نگار کہتے ہیں کہ ادبی اور تخلیقی تراجم کو دیگر ترجموں پر وہی فوقیت حاصل ہے جو بدر منیر کو دیگر چاندوں پر ہوتی ہے۔ اس کے بعد مضمون نگار نے فکشن اور افسانوی تراجم کے لیے مترجمین کے اندر درکار صلاحیتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے بقول چونکہ فکشن اور افسانہ کسی بھی سماج اور ملت کے دیگر انواع ادبی کے مقابلے میں زیادہ عکاسی کرتا ہے اس لحاظ سے مترجم کا فرض ہے کہ وہ زبان مبدا کی سماجی اور سیاسی تاریخ پر طائرانہ نظر رکھتا ہو تاکہ افکار مصنف کے مقابلے میں خطا کا شکار نہ ہو۔ مترجم پر لازم ہے کہ وہ ایک زبان کی لفظی اور لسانی قید میں اس قدر نہ الجھے کہ فکر اور مقصود مصنف پامال ہو جائے۔

اس کے بعد مصنف نے ہندوایران کی مشترکہ افسانوی روایت پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ روایت ویدائی اور اوستائی داستانوں سے شروع ہوتی ہے جو کہ اکثر نیکی اور بدی کے معرکوں کی شکل میں ہم تک پہنچتی ہے۔ تاہم اس کو ایک مستقل جہت بزرو گویہ بن اظہر کے ترجمہ پنچ تنتر (کلیلہ و دمنہ) سے ملتی ہے اور بیسویں صدی میں یہ روایت جدیدیت سے روشناس ہوتی ہے۔ اس کے بعد مصنف نے بیسویں صدی میں ہونے والی سیاسی کشمکشوں کا جائزہ لیا ہے جیسے غدر وغیرہ اور

کہا ہے کہ یہ جدوجہد ہندوستان اور ایران میں مشترک تھی۔اس جدوجہد کے نتیجے میں ایسے فنکار ابھر کر آئے جنہوں نے سماجی پریشانیوں کو اجاگر کیا۔اس کے بعد کا دور منٹو کا ہے جنہوں نے سماج کے درد کو فکشن کا روپ دیا۔

آخر میں مصنف نے نیر مسعود کے فارسی تراجم کا جائزہ لیا ہے۔ نیر مسعود نے غلام حسین سعدی کی دو داستانوں کا ترجمہ کیا ہے۔ایک 'بھکاری'اصل عنوان'گدا' اور دوسرے 'روضے والی' جس کا اصل عنوان 'فقیر' ہے۔ نیر مسعود نے پہلے افسانے میں ہندوستان میں رونما ہونے والے استعماری خسارے کو دیکھا ہوگا اس لیے اس کا انتخاب کیا ہوگا۔ دوسری داستان میں بھی گداگری کو دکھایا گیا ہے۔ مضمون نگار لکھتے ہیں کہ نیر مسعود کے ان انتخابات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ہندوستانی سماج میں پھیل رہے فقر، ظلم ،استحصال، لالچ، سرمایہ گزاری جیسی بیماریوں پر عمیق نظر رکھتے ہیں اس لیے آپ کا انتخاب سماج کے مختلف گوشوں کی اصلاح پر مبنی ہے۔اس کے علاوہ نیر مسعود نے بابا مقدم کے 'قفسہا' عنوان ترجمہ 'پنجرے' اور 'لاشہ مار'عنوان ترجمہ' مردہ سانپ' جیسے افسانوں کا ترجمہ کر کے اردو کو مالا مال کیا ہے۔

اس کے بعد مصنف نے نیر مسعود کے تراجم کا لسانیاتی جائزہ لیا ہے اور کہا ہے کہ نیر مسعود نے اتنی خوبصورتی سے محاوراتی ترجمہ کیا ہے کہ گویا یہ افسانے خود اردو زبان میں لکھے گئے ہوں۔اس کے بعد مصنف نے کچھ اقتباسات اور ان کے تراجم پیش کرتے ہوئے ان کا لسانیاتی جائزہ لیا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے ترجمے کے چند خامیوں کی طرف بھی نشاندہی کی ہے۔

مضمون کا عنوان: **ترجمہ کے چند پہلو**	
مضمون نگار: سید ہاشمی فرید آبادی، عبدالمجید سالک، ممتاز حسین	**رسالہ کا نام: ماہِ نو**
صفحہ نمبر: 43-39	جلد نمبر: 4 شمارہ نمبر: 12
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: مارچ 1952
مقام اشاعت: کراچی	مطبع:
ناشر: ادارہ مطبوعاتِ طلبا، لاہور	ایڈیٹر: رفیق خاور

اس مضمون کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جس میں پہلا حصہ سید ہاشمی فرید آبادی، دوسرا حصہ عبدالمجید سالک اور تیسرا حصہ ممتاز حسین نے لکھا ہے۔ اس مضمون میں اصل اور ترجمہ کے درمیان فرق اور ترجمہ نگار کے لیے درکار صلاحیتوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تصنیف کا علمی رتبہ اصل پر فائق ہے تاہم اچھا مترجم ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اچھا انشاپرداز بھی ہو۔ حالانکہ انشاپرداز کے لیے دوسری زبان سے واقف ہونا لازمی نہیں ہے۔ کچھ مترجمین ترجمے میں اپنا اسلوب نگارش پیدا کر دیتے ہیں تاہم عام طور پر مترجم کو اصل مصنف کی طرز تحریر کا اثر قبول کرنا پڑتا ہے۔ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب اصل عبارت شاعرانہ یا خاص ادیبانہ رنگ میں لکھی گئی ہو۔ اس طرح کی عبارت کو اپنی زبان میں اسی حسن و خوبی سے ادا کر دینا خود مترجم کی انشاپردازی کا کمال ہوتا ہے۔ ایسے مرحلوں میں دونوں زبانوں کی قوت بیان، فصاحت اور معنویت کا بھی توازن واضح ہو جاتا ہے۔

مضمون میں کہا گیا ہے کہ اردو ترجموں میں تحریر ذرا ہلکی معلوم ہوتی ہے جس کی وجہ زبان کا قصور نہیں بلکہ اہل زبان کے ذہنی اور تعلیمی معیار کی پستی کا دخل ہے۔ گزشتہ پچاس برسوں میں اردو نے ترقی کی لیکن ادبی پیداوار میں وہ معنوی گہرائی نہیں پائی جاتی۔ اردو ترجمے میں ابتری اور اس کی بدولت خود زبان میں خرابی کا ایک سبب اردو روزنامے ہیں جن کی زبان سخت اصلاح کی محتاج ہے۔ اس کے بعد مضمون نگار لکھتے ہیں کہ اگر اخباری مترجم سادگی سلاست اور محاورۂ اردو کو مد نظر

رکھ کر ترجمہ کیا کریں تو کسی کو الجھن کا کوئی موقع نہ ملے۔اس کے لیے ضرورت ہے کہ جہاں طویل فقرے پائیں اس کو چند فقروں میں تقسیم کر دیں اور ترجمہ پڑھ کر ایک مرتبہ دیکھ لیں کہ آیا اصل مطلب ادا ہو گیا۔ڈکشنری مترجم کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔اس کو ہر وقت حرز جاں بنائے رکھنا چاہیے۔

مضمون کا تیسرا حصہ ممتاز حسین کا لکھا ہوا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ بظاہر ترجمے کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک ایسے افکار و خیالات کا ترجمہ جن کے اظہار میں احساسات سے آزاد ہو کر خیالات کی ترجمانی کی گئی ہو جیسے فلسفہ اور سائنس وغیرہ۔ دوسرے ایسے افکار کا ترجمہ جن میں لازماً احساسات شامل ہوں جیسے شعر وادب وغیرہ۔ جب تک ترجمہ کرتے وقت اس امتیاز کو اپنے سامنے نہ رکھیں کامیاب مترجم نہیں بن سکتے۔ضرورت ہے کہ ہم اپنی زبان کی ساخت اور صلاحیت کو سمجھیں۔اس ضمن میں مضمون نگار نے چند کتابوں کے حوالے دیے ہیں جن کے اچھے اور خراب ترجمے کیے گئے ہیں۔اس سلسلے میں انہوں نے طباطبائی کی نظم "شام غریباں" کی مثال دی ہے جو ولیم گرے کے مرثیے Elegy in a church yard کا ترجمہ ہے۔اس کی خوبی یہ ہے کہ شاعر کے خیالات میں کہیں تصرف نہیں کیا گیا ہے اور انہیں کم و بیش تاثرات اور احساسات کی گہرائیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جو اصل نظم میں ملتی ہیں۔

اس کے علاوہ ہمیں یہ بات بھی دھیان میں رکھنی چاہیے کہ شعر کا ترجمہ شعر ہی میں ہو سکتا ہے جس کی بنا پر عنایت اللہ مرحوم کے کیے گئے شیکسپیئر کے ڈراموں کے تراجم بے نتیجہ نظر آتے ہیں اس لیے کہ انہوں نے نظم کا ترجمہ نثر میں کیا ہے۔اس کے مقابل ایمرسن کی ایک نظم کا علامہ اقبال نے "رخصت اے بزم جہاں" کے عنوان سے منظوم ترجمہ کیا ہے جو اتنا حسین ہے کہ اسے مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔اس ترجمے کی یہی خوبی ہے کہ مترجم نے نہ صرف شاعر کے خیالات بلکہ احساسات بھی پیش کیے ہیں اور اس کے لیے حسب ضرورت انگریزی کی تلمیحات اور استعاروں کو اردو کی تلمیحات اور استعاروں میں ڈھالا گیا ہے۔اس کے بعد مضمون نگار نے افسانوں اور ناول کے تراجم پر بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ اردو میں ناول کے تراجم کم ہی ملتے ہیں اس لیے کہ ناول کا کینوس اتنا وسیع ہوتا ہے اور صفحات اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ مترجم کے لیے جذبات کو ایک ہی سطح پر رکھنا ناممکن ہوتا ہے۔

مضمون کا عنوان: **ترجمہ کے اصول**	
مضمون نگار: سید باقر حسین	**رسالہ کا نام: ماہِ نو**
صفحہ نمبر:22-19	جلد نمبر:03 شمارہ نمبر:06
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: ستمبر 1950
مقام اشاعت: کراچی	مطبع:
ناشر: ادارہ مطبوعاتِ طلبا، لاہور	ایڈیٹر: فضل حق قریشی (عارضی)

مضمون کی ابتدا میں مضمون نگار نے ایک انگریزی کتاب کے اردو ترجمے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس ترجمے کے پڑھنے کے بعد ان کا یہ بھرم جاتا رہا کہ اردو بہت گراں نماز بان ہے جس میں ہر خیال کو ادا کرنے کی طاقت ہے۔ اب ان کا یہ خیال ہے کہ اردو صرف شعر و ادب تک محدود اور اس مخصوص درباری تہذیب تک محدود ہے جو ہمارے پیشرو ہمارے لیے ورثہ میں چھوڑ گئے ہیں۔ اردو میں ابھی تک وہ الفاظ ہیں ہی نہیں جو مغرب سے آئے ہوئے خیالات کو ادا کر سکیں۔ یہ بات صرف اصطلاحات تک ہی محدود نہیں ویسے بھی اردو میں جب علوم و فنون ہی موجود نہیں تو اصطلاحات کہاں سے آئیں گی۔ غضب تو یہ ہے کہ ترقی یافتہ زبانوں میں جو عام بول چال کے الفاظ ہیں ان سب کے مترادفات بھی اردو میں موجود نہیں ہیں۔

اس کے بعد مضمون نگار نے ان چند الفاظ کا ذکر کیا ہے جس کا متبادل ان کے بقول اردو میں نہیں ہیں۔ جیسے Confidential, Vulnerable, Public, Civil , Policy وغیرہ۔ اس سلسلے میں انہوں نے ریاست حیدر آباد میں درسی اور غیر درسی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے کی جانے والی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ یہاں جو الفاظ اور اصطلاحات استعمال ہوئے انہیں حیدر آباد کے باہر کوئی جانتا بھی نہ تھا چنانچہ یہ الفاظ و اصطلاحات کبھی رائج نہ ہو سکے۔ اس کمی کو دور کرنے کی خاطر مضمون نگار کا خیال ہے کہ فارسی اور انگریزی کی مدد لینی چاہیے اور

انگریزی کے کئی الفاظ کو جوں کا توں استعمال کرنا چاہیے جیسے Studio کو استودیو، Technique کو تکنیک Stanza، کو استنزا وغیرہ۔

الفاظ کا ترجمہ کرنے کے لیے مضمون نگار نے درج ذیل اصولوں کو سامنے رکھنے کی ہدایت دی ہے۔

1۔ ترجمہ صحیح ہونا چاہیے۔

2۔ حتی الامکان عام فہم ہونا چاہیے۔

3۔ سبک اور خوبصورت ہونا چاہیے۔

مضمون نگار کے خیال میں عربی کے مقابل فارسی الفاظ زیادہ عام فہم ہوتے ہیں تاہم بسا اوقات عربی کے الفاظ بھی لیے جا سکتے ہیں۔ ترقی یافتہ زبانوں کے جملے اکثر پیچیدہ اور لمبے ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اسالیب مقرر اور عام فہم ہو چکے ہیں اور مطلب سمجھنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوتی لیکن اردو میں ایسے جملوں کا ترجمہ کرتے وقت انہیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر لینا بہتر ہوتا ہے۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ عبارت کا ترجمہ کرنا مشکل ہوتا ہے اور اس کے لیے ترجمے کا کوئی ایسا اسلوب تلاش کرنا چاہیے جو لفظی ترجمہ نہ ہو بلکہ اصل کے مرکزی خیال کو ادا کرتا ہو۔ اس کے بعد سطور سے بالا عبارت کا ترجمہ کرنے کے لیے انہوں نے چند اصول بیان کیے۔

1۔ ترجمہ حتی الامکان تحت اللفظ ہونا چاہیے، اصل عبارت کا محض خلاصہ مطلب نہیں ہونا چاہیے۔

2۔ ترجمہ حتی الامکان محاورۂ زبان کے مطابق ہونا چاہیے۔

3۔ الفاظ کے وزن اضافی کا خیال رکھنا چاہیے تاکہ اصل عبارت میں ان کی جو اضافی اہمیت ہے وہ ترجمے میں بھی باقی رہے۔

4۔ حتی الامکان ایسے الفاظ کے ترجمے سے گریز نہیں کرنا چاہیے جن کے مترادفات اردو میں پہلے سے موجود نہ ہوں۔ زبان کو وسعت دینے کا طریقہ یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہر لفظ کا مترادف تلاش کرنے کی کوشش کی جائے خواہ مترادف نامانوس الفاظ ہی کیوں نہ ہو۔

مضمون کا عنوان: **ترجمے کی تجرید**	
مضمون نگار: احمد سہیل	**رسالہ کا نام: ادبِ لطیف**
صفحہ نمبر:13-05	جلد نمبر:54 شمارہ نمبر:03
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: مارچ،1988
مقام اشاعت: لاہور	مطبع: مکتبہ جدید پریس لاہور
ناشر: افتخار علی چودھری	ایڈیٹر: صدیقہ بیگم

مضمون نگار لکھتے ہیں کہ کوئی طنزیہ، مزاحیہ یا بچوں کے ادب پر مضمون لکھنا یا اس کا ترجمہ کرنا انتہائی کٹھن کام ہے اس لیے کہ جہاں تک ترجمے کا تعلق ہے اس مزاج اور انداز نگارش متنازعہ ہے۔ ترجمہ لسانی فن ہے کیوں کہ زبانوں سے گہری واقفیت ہی ترجمے کے فن کو خوب سے خوب تر بناتی ہے۔ کسی زبان سے واجبی سی واقفیت، زبان کی معنویت اور اس کے پس منظر سے عدم آگاہی بھی ترجمہ کو سب سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہے۔ ادبی تخلیق خاص طور پر شاعری ترجمہ ہو کر اپنی ہیئت ہی کھو بیٹھتی ہے۔ ترجمہ کا یہ فطری مزاج ہے کہ وہ کسی دوسری زبان میں ترجمہ ہو کر اپنے اصل سے تھوڑا بہت دور ہو جاتا ہے۔ ترجمہ زبان کی ایک بڑی تبدیلی ہوتی ہے مگر اسے مفہوم کی تبدیلی نہ تصور کیا جائے۔ مضمون نگار کے مطابق ہیئت میں تبدیلی قابل قبول ہے تاہم معنویت میں کمی نہیں ہونی چاہیے۔ ترجمہ بنیادی طور پر ایک زبان سے دوسری زبان میں ترسیل ہے، وہ کسی ادب پارے کے سیاق کو کلی طور پر تبدیل نہیں کرتا۔

اس کے بعد مضمون نگار نے ترجمہ کے اصول اور عمل پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مترجم، ترجمہ کرنے سے قبل ایک منصوبہ تشکیل دیتا ہے اور یہی ترجمہ کی اصل ہے۔ مترجم کو ترجمہ کرتے ہوئے کبھی یہ احساس نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ پہلے اپنے فطری میلان کے تحت ترجمہ کرے پھر اس پر نظر ثانی کرے۔ بعض دفعہ تو کسی تخلیق کا ترجمہ کئی بار کیا جاتا ہے پھر بھی تشنگی باقی رہتی ہے۔ مترجم کو کسی تخلیق پارے کا کرافٹ تشکیل نہیں دینا چاہیے اور کامیاب مترجم کبھی

دوسرے کی تخلیق میں ردوبدل نہیں کرتا بلکہ وہ کرافٹ کو بھی ترجمہ کر دیتا ہے جو آسان کام نہیں بلکہ تکنیکی مہارت ہے۔ یہ ایک ایسی کامیابی ہے جو انتہائی کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ ترجمے کی چند حدود ہیں جن کے آگے پیچھے جانے سے ترجمے کا میزان بگڑ جاتا ہے۔ ترجمہ ایک محدود اور مشکل عمل ہے اور مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ دونوں زبانوں میں دسترس رکھتا ہو۔ ایک طرف تو مترجم میں ادیبوں والی خصوصیات ہونی چاہیے دوسری طرف مترجم کی تکنیکی امور سے کماحقہ آگہی ضروری ہے۔ ترجمہ وہی بہتر تصور ہوتا ہے کہ اگر قاری کو پتہ نہ ہو کہ یہ ترجمہ ہے تو وہ اسے اپنی ہی زبان سمجھے۔ ترجمہ کرنے والے کو معلوم ہونا چاہیے کہ مترجم نے اب تک کیا لکھا ہے۔ اچھا مترجم ایک تخلیق کار کے کام کو جغرافیائی حدود بندیوں سے آزاد کرواتا ہے۔ ترجمہ ثقافتی اعتبار سے غیر ملکی عنصر کو ضرور شناخت کرواتا ہے اور یہی ترجمے کے معیار پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ ترجمہ شروع کرنے سے قبل چند نکات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے جو ترجمے کے فن کی ساخت کو منظم بناتے ہیں، یہ درج ذیل ہیں:

1۔ ترجمے کی ہئیت اور معنویت

2۔ ترجمے کی اقسام

3۔ زبان کی معنوی ساخت

4۔ مکمل معنویت

5۔ ترجمے منصوبہ جاتی مراحل

6۔ الفاظ کے سمندر میں معنوی انتخاب

7۔ لغت کے معنوی روابط

8۔ الفاظ کی گروہ بندی، تقابل اور معنویت کی تسخیر

9۔ لسانی لغت کے نظام میں پائے جانے والی یکسانیت

10۔ لغت کی کثیر التعداد حسیات

11۔ لغت کی کثیر التعداد مجازیت

12۔ ذاتی حوالے

13۔ لغوی اجزا کی سیاقی صورت حال

14۔ لغوی اجزا کا تصادم

15۔ تصورات کی تقسیم میں لغوی میزان

16۔ نامعلوم تصورات میں لغوی میزان

17۔ لغوی یکسانیت کی سفارشات ایک خصوصی مسئلہ وغیرہ

مضمون کا عنوان: **ادبیات عالم میں ترجمے کی روایت**	
مضمون نگار: ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	**رسالہ کا نام: سہ ماہی اردو**
صفحہ نمبر:130-111	جلد نمبر: 26 شمارہ نمبر: 4
دورانیہ: سہ ماہی	سنہ اشاعت: اکتوبر تا دسمبر 1986
مقام اشاعت: کراچی	مطبع: انجمن پریس، نشتر روڈ کراچی
ناشر: انجمن ترقی اردو پاکستان۔ کراچی	ایڈیٹر: نورالحسن جعفری

مضمون نگار نے اس حقیقت سے اپنے مضمون کا آغاز کیا کہ جب کوئی قوم علوم و فنون میں ترقی کا پہلا قدم اٹھاتی ہے تو سب سے پہلے علمی زبانوں کے تراجم سے اپنی زبان کو سرمایہ دار بناتی ہے اور اپنے علمی خزانوں کو معمور کرتی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے مشرق و مغرب میں ترجمے کی روایت کا جائزہ لیا۔ مشرق میں آج سے 1434 سال پہلے ساسانی دور کے ایران میں سنسکرت کی کتاب "ہتوپدیش" کے ایک حصے "پنچ تنتر کا ترجمہ بزرجمہر اور حکیم بروزیہ کی کوششوں سے 550ء میں پہلوز بان میں "کرنک ودمنک" کے نام سے ہوا۔ اس سے قبل دنیا کے قدیم ترین ادب کی معلومہ مثال سامرہ ہے جو 5 ہزار سال قبل مسیح ہے۔ اس زبان کی تہذیب سومیری یا سومیرا کہلاتی ہے جو کہ رگ وید سے ڈھائی ہزار سال سے پانچ ہزار سال قبل احاطہ تحریر میں آنا شروع ہوا۔ جو کہ عبرانی اور یونانی ادب سے 2 ہزار سال پہلے کا زمانہ بنتا ہے۔

رومن زوال اور نشاۃ ثانیہ کی درمیانی صدیاں مورخین کے نزدیک ازمنہ تاریک قرار پائیں لیکن دراصل یہی وہ زمانہ ہے جب مسلمانوں نے قدما کے علمی اور ادبی سرمائے کو برباد ہونے سے بچالیا۔ مامون الرشید نے جدان کے مہابیوں، نسطوری عیسائیوں اور ہند کے علما کی مدد سے سریانی، پہلوی، یونانی اور سنسکرت سے مختلف علوم کو عربی میں منتقل کروایا۔ عباسی بیت الحکمت کم و بیش دو سو سال تک کام کرتا رہا۔ عہد وسطیٰ میں مسلمانوں نے دنیا بھر کا علمی سرمایہ اپنی زبان میں منتقل کر لیا تھا۔ بیروت کے عیسائی مورخ نوفل آفندی نے اپنی کتاب "صناجتہ الطرب" میں اس دور پر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ اس کے بعد مضمون نگار نے مسلمانوں کے دورِ حکمرانی میں ہونے والے تراجم، ان کے اسلوب کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ان

میں عربی کے مشہور مترجمین، فارسی کے قدیم عربی مترجمین، سنسکرت کے قدیم عربی مترجمین، موجودہ دور کے عربی مترجمین، یونانی، لاطینی اور سریانی زبان کے عربی مترجمین، عربی میں ترجمے کے جدید دور، جدید دور کے تراجم پر فرانسیسی اثر وغیرہ کا تذکرہ شامل ہے۔

اس کے بعد مضمون نگار چین میں ترجمہ کی روایت کی جانب آتے ہیں۔ چینی ادب زمانہ قدیم سے ایک الگ تھلگ جزیرے کی مانند رہا ہے جب کہ سفر نامہ نگاروں نے اس کا رابطہ باقی ماندہ دنیا سے جوڑنے کی سعی کی ہے۔ James Legge نے چینی شاعری کے اولین مترجم کے طور پر شہرت پائی لیکن اس خصوص میں خاتون مترجم Helen Waddel کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ آرتھر ویلی نے چینی شاعر Cau Yuan کے علاوہ بے شمار چینی شعرا کو تراجم کے ذریعہ پوری دنیا سے متعارف کروایا ہے۔

بعد ازاں مصنف نے ترکی زبان میں تراجم کی روایت کا جائزہ لیا۔ ابراہیم شناسی آفندی پہلا ترک ادیب تھا جس نے ترکی اور فرانسیسی ادب کے تراجم شائع کروائے اور عثمانیوں کے دور میں زبان و ادب کے ساتھ برتی جانے والی غفلت کا ازالہ کیا۔ پھر روسی ادب میں ترجمے کی روایت پر روشنی ڈالی گئی ہے جس کے مطابق روسی ادب اپنی ابتدا سے ایک خاص قسم کے بکھراؤ کا شکار رہا بلکہ زار کے زمانے تک روس کے پاس ادب نام کی کوئی شئے ہی نہیں تھی۔ روسی زبان و ادب کے اثر انداز ہونے کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ تاتاری شاعری نے ازبکی اور ترکمانی شاعری کو نکھار بخشا جب کہ تاجکی ادب نے ازبکستان اور ترکمانستان پر اپنے اثرات چھوڑے اور ایرانی تہذیب کی معرفت جارجیہ اور آذر بائیجان کے ادب کو بھی بڑی حد تک متاثر کیا۔ روسی ادب کا اثر یوکرینی ادب پر بہت گہرا رہا ہے اور اس کے بدلے میں یوکرین کے ثقافتی منظر نامے نے روسی ادب کو بھی بہت کچھ دیا جس کا سب سے بڑا ثبوت گوگول کی تخلیقات ہیں۔ اس کے بعد مصنف نے لاطینی امریکی ممالک میں ادب و ترجمے کی روایت کا جائزہ لیا ہے۔ اطالوی عالم اور مفکر جرارڈ آف کری مونا نے 80 ضخیم کتابیں عربی سے لاطینی زبان میں منتقل کیں۔ ابو بکر رازی کو لاطینی زبان میں سب سے زیادہ قابل توجہ سمجھا گیا اور جرمن مفکر ہمبولٹ کہتا ہے کہ "عربوں کو طبیعیاتی سائنسوں کا حقیقی بانی سمجھنا چاہیے"۔

یورپ میں صنف افسانہ پر نگاہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی ابتدا اٹلی کے بوکاچیو کی تقلید میں ہوئی جبکہ بوکاچیو نے 1348 میں 100 افسانوں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا جو بڑی حد تک الف لیلہ کے زیر اثر تھا۔ مختصراً یہ محسوس ہوتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا بھر کی زبانوں اور ادبیات کی حد بندیاں ٹوٹ گئیں۔ جنگ کی تباہ کاریوں کو اس وقت کے ادب کی دھڑکنوں میں سنا جاسکتا ہے۔ پرل ایس بک کی Good Earth اور ولیم سرویاں کی The Huma Cmmady جیسی لازوال تخلیقات کے، تراجم کی معرفت بننے والی زنجیر نے ادبیات عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

مضمون کا عنوان: مغرب سے ادبی اور علمی تراجم	
مضمون نگار: ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	رسالہ کا نام: نقوش
صفحہ نمبر:195-183	جلد نمبر: شمارہ نمبر: 137
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: دسمبر 1988
مقام اشاعت: لاہور	مطبع:
ناشر: ادارہ فروغ اردو، لاہور	ایڈیٹر: جاوید طفیل

زبان و ادب کی ترقی میں ترجمہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ترجمے ذریعہ زبان مختلف جہات میں پھلتی پھولتی ہے اس طرح جہاں وہ شعر کی زبان بنتی ہے وہیں فلسفے کی بھی زبان بنتی ہے۔ ہمارے ہاں ادبی اور علمی سطح پر ایک عجیب و غریب کشمکش دکھائی دیتی ہے۔ ادبیوں کے ایک گروہ کے خیال میں پیروی مغرب ہی میں زندہ رہنے کی واحد صورت تھی، دوسرا گروہ مغرب کے پہیے کا بار احسان رہتے ہوئے ابن العربی اور ابن رشیق پر گزارا کرنا چاہتا تھا جب کہ تیسرے گروہ کے خیال میں مغرب سے بھی صاحب سلامت اور مشرق تو تھا ہی اپنا۔ سو 19 ویں اور 20 ویں صدی میں ہم مشرق اور مغرب کے درمیان بری طرح ڈگمگاتے پھرے۔ یہ ایک دو طرفہ آگ تھی جہاں ہمارا ادیب مغرب کی طرف تجسس کے ساتھ دیکھ رہا تھا اور مغرب نے مشرقی لبادہ اوڑھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کھیل میں ہم نے پایا کم اور کھویا زیادہ۔ ایذرا پاؤنڈ میگنا کارٹا کے ساتھ ساتھ مشرقی فلسفے اور مشرقی شاعری کے تراجم اور حوالوں کی ضرورت محسوس کرتا ہے اسی لیے بیشتر نئے مغربی ادیب بدھسٹ بن گئے تھے۔

مغرب میں اس میلان کے ابتدائی نقوش مارلو اور شیکسپیئر کے ڈراموں میں دکھائی دیتے ہیں البتہ اردو میں مغربی زبانوں سے تراجم کا جائزہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اردو زبان و ادب کی وسعت اور گہرائی و گیرائی میں اخذ و ترجمے کا خاصا اہم کردار رہا ہے مثلاً یہ کہ ادبی تراجم نے نئے اسالیب بیان کو جنم دیا۔ نئے طرز احساس کو ابھارا اور اصناف کو فنی وقار بخشا۔ یہ تبدیلیاں محض ہیئت کی سطح پر نہ تھیں بلکہ مضمون کے ساتھ ادبی رویہ کی تبدیلیاں بھی تھیں اور قدامت پسندی کی زنجیروں

سے آزاد ہو کر نئے زمانے میں سانس لینے کا جتن بھی۔ مترجمین کی ترجمے کے فن سے ناواقفیت اور تن آسانی نے تراجم میں ایک نیا طرز تحریر ایجاد کیا جس کے لیے انگریزی میں Journalese کی اصطلاح موجود ہے یعنی ایک ایسی ناقص زبان لکھی گئی جو نہ تو خیالات کے اظہار پر قادر ہے اور نہ ہی معنی کی ترسیل پر۔

مہدی جعفر نے مشرق اور مغرب کے مزاجوں کی سطح پر فرق کو کیمیا گری اور کیمیا دانی کا فرق قرار دیا ہے۔ اردو ادب کو تراجم کی معرفت کیمیا گری سے کیمیادانی کی طرف لانے کا کام یوں تو فورٹ ولیم کالج میں ہونا قرار پایا تھا لیکن اس باب میں سر سید احمد خاں بازی لے گئے۔ انہوں نے اردو ادب کو جس ذہنیت کا تحفہ دیا اس کی بنیادیں عقلیت، اجتماعیت، مادیت اور حقائق نگاری پر تھیں۔ مضمون نگار لکھتے ہیں کہ اردو میں ترجمہ نگاری کے مروجہ چلن پر عسکری صاحب نے ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ مجموعی طور پر ترجموں کے ذریعہ ہمارے تخلیقی ادب کو زیادہ فائدہ نہیں پہنچا جس کی سب سے بڑی وجہ یہ رہی کہ مترجمین ترجمے کی اہمیت سے ناواقفیت کی بنا پر اسے تخلیقی مسئلہ نہیں سمجھتے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ ہمارے بیشتر مترجمین نے روانی اور سلاست کے پیچھے بھاگتے ہوئے یہ نہیں سوچا کہ اردو نثر کا بڑا مسئلہ تو طویل اور پیچیدہ جملے لکھنے کا ہے اور کسی ترقی یافتہ زبان کے فن پارے میں تخلیق کار نے پیچیدہ تر احساسات و جذبات کو لفظوں میں منتقل کرتے وقت یہ کارنامہ انجام دیا ہے تو کوشش کر کے اسے انہی قواعد و ضوابط کے ساتھ اردو میں کیوں نہ منتقل کر لیا گیا۔ اس سے ہماری زبان میں بھی اسلوبیاتی سطح پر کوئی نئی راہ سوجھنے کا امکان پیدا ہوتا۔ اس کے بعد مضمون نگار نے اردو کی مختلف اصناف میں ترجمے کے زیر اثر پیدا ہونے والے مثبت اور منفی اثرات کا سرسری جائزہ لیا ہے۔

ناولوں کے متعدد تراجم ہونے کے باوجود شروع میں ہمارے ہاں داستان، تمثیل اور ناول میں فرق مٹا ہوا تھا۔ تاہم بعد میں مسلسل ناولوں کے تراجم عام ہونے سے ہمارے ہاں نہ صرف یہ کہ ناول کا چلن عام ہوا بلکہ ناول کے عناصر ترکیبی کو بھی سمجھنے میں مدد ملی۔ انگریزی سے اسٹیج ڈراموں کو اردو میں منتقل کرنے کی بات کی جائے تو افسوس ہوتا ہے کہ شیکسپیئر کے بعض تراجم ناقص ہیں، ان میں پلاٹ کی تبدیلیاں کی گئی ہیں اور بڑے پیمانے پر کانٹ چھانٹ کی گئی ہیں۔ افسانے کے صنف میں تین نام بہت ترجمہ ہوئے یعنی چیخوف، موپاساں اور رابندر ناتھ ٹیگور۔ سفر نامے کی صنف ہمارے ہاں نئی نہیں ہے لیکن ہمارے سفر نامے لکھنے والوں پر مغربی سفر نامے کے اثرات نمایاں ہیں۔

اردو ادب میں منظوم ترجمے کی روایت نظم طباطبائی کی "گور غریباں" سے ہوتی ہے جو مشہور نظم ایلجی کا ترجمہ ہے۔ اقبال نے ٹینی سن، لانگ فیلو اور ولیم کاؤپر کی متعدد نظموں کے ترجمے کیے۔ آخر میں مضمون نگار نے کہا کہ ہمیں عربی،

فارسی اور ہندی کی خصوصیات کا استعمال کر کے ترجمہ کرنا چاہیے اور رشید حسن خاں کی کتاب "اردو کیسے لکھیں" اور "اردو املا" کو علمی و ادبی حلقوں میں زیر بحث لا کر اردو زبان کے لکھنے کے سلسلے میں راہنما اصول بنائے جا سکتے ہیں۔

مضمون کا عنوان: **ترجمے کا فن: جواز اور مشکلات**	
مضمون نگار: مرزا حامد بیگ	**رسالہ کا نام: شب خون**
صفحہ نمبر: 73-55	جلد نمبر: 22 شمارہ نمبر: 151
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: مارچ، اپریل 1989
مقام اشاعت: الہ آباد	مطبع: تاج آفسیٹ پریس الہ آباد
ناشر: ۳۱۳ رانی منڈی الہ آباد	ایڈیٹر: عقیلہ شاہین

مضمون نگار نے سب سے پہلے ترجمے کی تعریف بیان کی ہے اور اس کے بعد ترجمے کے عمل پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ترجمہ کسی متن کو دوسری زبان میں منتقل کرتے ہوئے اس کی تعبیر کرتا ہے یعنی ترجمے کا عمل ایک علمی یا ادبی پیکر کو دوسرے پیکر میں ڈھالنے کا نام ہے۔ دوسری زبانوں کی ادبیات سے ماخوذ ہونے کے سبب اس میں کچھ کچھ غیریت کا احساس باقی رہ جاتا ہے اس لیے اس کا مطالعہ مستعار اور بالواسطہ ادب کی حیثیت سے کیا جاتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا میں اسے طبع زاد ادب کے مقابلے میں دوسرے درجہ کی چیز شمار کیا جاتا ہے۔

ترجمے کا عمل کیا ہے؟ ہم ترجمے کا کامل تجزیہ نہیں کر سکتے لیکن دیکھ سکتے ہیں کہ ارنسٹ فینولوسا اور ایزرا پاؤنڈ جیسے مترجمین نے ماضی کی قدیم شاعری کو حال کی شاعری میں بدل دیا جبکہ سیموئل جانسن نے کہا تھا کہ شاعری ترجمہ ہو ہی نہیں سکتی۔ امریکی ناقد، رینا ٹوپوگولی نے اس نفسیاتی خواہش کے بارے میں تحقیق کی جو ایک مصنف کو مترجم بنا دیتی ہے وہ سوال کرتا ہے کہ آیا یہ ویسی ہی خواہش ہے جس کے تحت مصور یا مجسمہ تراش اصل کی نقل تیار کرتا ہے جبکہ محرک یکساں ہونے کے باوجود نتیجہ یکساں نہیں ہوتا۔ یہی ترجمے میں ہوتا آیا ہے۔ رینا ٹوپوگیولی لکھتا ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ترجمہ کرنا ترجمان کا فن ہے لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ مترجم ترجمانی کرنے والا وہ واحد فنکار ہے جس کا کام اصل سے مماثل بھی ہے اور مختلف بھی۔ اس کے علاوہ ترجمانی کرنے والے فنکار یا تو مماثل گروہ سے ہیں یا مختلف گروہ سے۔

تجریدی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ترجمہ کرنے والا اور اصل مصنف دونوں ایک ہی جمالیاتی مادے کو تبدیل کرتے ہیں یعی زبان کو لیکن زیادہ ٹھوس اور متعین نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مترجم ایک ایسا لسانی اور ادبی مواد پیش کرتا ہے جو متن سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ علمی اصطلاح میں کہا جائے تو متن اور ترجمہ دونوں ایک ہی نفس مضمون سے متعلق ہیں لیکن پھر بھی ایک عجیب انداز سے مختلف ہیں۔ یہی وہ عجیب بات ہے جو مترجم کو تخلیق کرنے والا بنادیتی ہے۔ اس پہلو سے مترجم دیگر فنکاروں جیسے موسیقار، گلوکار اور اداکار سے بالکل الگ دکھائی دیتا ہے۔ یہ بھی دھیان میں رہے کہ مترجم کے کام کی نوعیت اسے وہ موقع فراہم نہیں کرتی جو اس کے حریفوں کو حاصل ہے۔ تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ مترجم ایک پابند شخص نہیں ہے بلکہ ایک پابند فنکار ہے جو صرف اسی وقت اطمینان کی سانس لیتا ہے جب دل کی راکھ انڈیلنے کو اسے ایک مناسب برتن مل جاتا ہے۔ یوں کسی حد تک ترجمہ ایک جناتی تسخیر کا عمل بھی ہے یعنی اپنے اندر کا جن ایک خارجی روح کے ذریعہ باہر نکالنا۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ مترجم ایک ایسا کردار ہے جو خارج کے ساتھ ساتھ داخل کے مصنف کو بھی ڈھونڈ نکالتا ہے۔

ترجمے کا عمل اس حد تک پیچیدہ اور پراسرار ہے کہ ایک شخصیت دوسری شخصیت میں ڈھلتی ہے اور تنقید محاکے کو کھلم کھلا دو جمع دو چار کے بجائے اشاروں اور کنایوں میں اس کی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ مترجم کا اصل کام دراصل نیاز و ناز کا امتزاج ہے۔ اس کی دو صفات انتہائی قابل تحسین ہیں یعنی ایک تو وہ مصنف کا دل سے احترام کرتا ہے یوں مکمل آزادی اور دیانت دارانہ پابندی کا یہ مقام اتصا (ترجمہ) سے دوسرے کی مصنوعات اپنے ٹریڈ مارک کے ساتھ بیچنے سے باز رکھتا ہے حالانکہ ترجمہ کرتے وقت وہ فن پارے کو اس طرح ڈھالتا ہے کہ کم از کم جزوی طور پر وہ اس کا خالق ضرور کہلا سکتا ہے لیکن یہ مترجم کی بڑائی ہے کہ وہ ایک عمدہ کاری گر کی طرح کام کرتا ہے دل اور روح کی صفائی کے ساتھ لیکن اپنا نام سامنے نہیں لاتا اور ترجمے کی حرمت کی مسلسل پاسبانی کرتا ہے۔ اس کے بعد مضمون نگار نے مترجم کے کام کے بارے میں رینا ٹو پوگیولی اور شلر وغیرہ کے بیانات درج کیے ہیں اور کہا ہے کہ ترجمے کا عمل ایک سیال مادے کو ایک برتن سے دوسرے برتن میں انڈیلنا یا ایک پرانی شراب کو نئی بوتل فراہم کرنا ہے۔ اس نظریہ پر ایک اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ مترجم کی ذات محض ایک خالی بوتل کی طرح نہیں ہوتی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مترجم بذات خود ایک زندہ ظرف ہے۔ ایک بے ہئیت سیال مادے یا موتیوں کی طرح چمکتی ہوئی شراب جسے وہ مزید اپنے اندر روک نہیں سکتا اور جب یہ سیال اچھلنے لگتا ہے تو وہ اسے مناسب ترین ظرف میں انڈیل دیتا ہے۔

مضمون کا عنوان: **اُردو میں علمی تراجم**	
مضمون نگار: ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	**رسالہ کا نام: ماہنامہ قومی زبان کراچی**
صفحہ نمبر:23-21	جلد نمبر: 57 شمارہ نمبر:9
دورانیہ:ماہنامہ	سنہ اشاعت: ستمبر1986
مقام اشاعت: کراچی	مطبع:
ناشر:انجمن ترقی اردو پاکستان	ایڈیٹر:ادیب سہیل

مضمون نگار نے زبان و ادب کی ترقی میں ترجمے کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ترجمے کے ذریعے جہاں گردو پیش کے علمی اثر و نفوذ کو قبول کیا جاسکتا ہے وہیں ترجمے کی تہذیب کے زیر اثر نئے الفاظ کا اخذ و انتخاب بھی ممکن ہے۔ خصوصی طور پر نوزائیدہ اور ترقی یافتہ زبانوں کے علمی اظہار و ابلاغ میں ترجمے بڑے معاون ثابت ہوئے ہیں نیز بلحاظ ہئیت و معنی نوزائیدہ زبانوں میں علمی مباحث کے اظہار کا ذریعہ بننے کی صلاحیت اور قوت پیدا ہوئی ہے۔ ترجمے کے ذریعہ زبان مختلف جہات میں پھولتی پھلتی ہے اس طرح جہاں فلسفے کی زبان بنتی ہے وہیں علم الشعر کو بھی صحیح طور پر بیان کرنے کی قدرت حاصل ہوتی ہے۔ بائبل کا انگریزی ترجمہ در حقیقت انگریزی اظہار میں عبرانی اجزا کی شمولیت کا واقعہ ہے۔

ہمارے شروع ہی سے سائنس کی بہ نسبت فلسفے کی طرف رجحان زیادہ رہا ہے۔ سائنٹفک سوسائٹیوں کے قیام کے ساتھ علوم جدیدہ کی مقبولیت بڑھی ہے۔ علوم جدیدہ سے مراد ہے:

1۔ ایسے علوم جو اہل یونان اور مسلم دانشوروں میں عام رہے لیکن نئے زمانے نے ان کی ساری اصول سازی کو تھیوری اور پریکٹکل سطح پر غلط ثابت کر دیا مثلاً قدیم مشرقی علم ہیئت اور کیمیا میں زمین و آسمان کا فرق پڑ گیا۔

2۔ ایسے علوم جو ہمارے لیے تو نئے نہیں تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ انہیں وسعت ملی جیسے میکنکس وغیرہ

3۔ ایسے علوم جن کا نام و نشان تک ہمارے ہاں نہیں ملتا مثلاً جدید دور الیکٹرسٹی وغیرہ

ترجمے کے باب میں انہیں علوم جدیدہ کے حصول کی خاطر شمس الامراء حیدر آباد دکن (1820ء) اور شاہان اودھ لکھنو (1830ء) کی کوششوں کو اولیت حاصل ہے۔ اس کے بعد مضمون نگار نے ان داروں کا ذکر کیا ہے جہاں انگریزی سے اردو تراجم کے ذریعہ جدید علوم کو اردو میں منتقل کیا گیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس کے باوجود تاحال عالمی سطح پر ترجمے کے مسائل سے متعلق بنیادی اصول وضع نہیں کیے گئے نتیجہ یہ ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی جیسی ترقی یافتہ زبانوں کے اہم مترجم ڈرائڈن کے مطابق بہت کم ترجمے قابل برداشت کہے جاسکتے ہیں۔ اور اس سے کہیں زیادہ گئی گزری صورت اردو زبان میں دکھائی دیتی ہے۔

اس بحث کے بعد مضمون نگار نے ترجمے کے چند اصول گنوائے ہیں جو حسبِ ذیل ہیں:

1۔ ہر انگریزی یا دیگر مغربی زبانوں کے لفظ کے لیے اردو میں ایک ہی متبادل لفظ طے کیا جائے۔

2۔ ایسی متبادل اردو لفظیات برتی جائے جس سے مشتقات وضع ہو سکیں۔

3۔ بہت سے انگریزی الفاظ فارسی اور عربی کے بگڑے ہوئے متعدد لفظوں کی طرح اردو میں مستعمل ہیں انہیں جوں کا توں رہنے دیا جائے۔

4۔ اصطلاحات سازی میں بھی یہی اصول برقرار رکھا جائے۔

5۔ فنی اصطلاحات کا ترجمہ کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اردو میں بھی متبادل لفظ اصطلاح کی حیثیت رکھتا ہو نہ کہ تشریح کی۔

6۔ مروج اصطلاحات کی جگہ نئی اصطلاحات وضع نہ کی جائیں۔

7۔ مختصرات کا ترجمہ نہ کیا جائے مثلاً گوٹ کی جگہ پورے لفظ گورنمنٹ کا ترجمہ کیا جائے۔

8۔ حتی الوسع ہندی اضافت اور حروفِ جار استعمال نہ کیا جائیں۔ مثلاً ٹائم گلاس کا ترجمہ ریت گھڑی ہو گا نہ کہ ریت کی گھڑی

9۔ علمی ترجمے میں اسمائے نکرہ کا کامل شعور ضروری ہے۔

مضمون کا عنوان: **ترجمے کی مشکلات**	
مضمون نگار: ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	**رسالہ کا نام: ماہنامہ قومی زبان کراچی**
صفحہ نمبر:28-19	جلد نمبر:57 شمارہ نمبر:12
دورانیہ:ماہنانہ	سنہ اشاعت:دسمبر1986
مقام اشاعت:کراچی	مطبع:
ناشر:انجمن ترقی اردو پاکستان	ایڈیٹر:ادیب سہیل

مضمون نگار نے اپنا مضمون امریکی ناقد فینگ کے نظریہ سے شروع کیا جس میں فینگ نے ترجمے میں پیش آنے والی مشکلات کی تین سطحوں کو بیان کیا ہے:

1. Adequate comprehension of the translated text
2. Adequate manipulation of the language translated into
3. What happens in between

فینگ کی بیان کردہ نمبر2 شکل پر میتھیو آرنلڈ اور ایزرا پاؤنڈ نے بحث کی ہے۔اس نوع پر بات کرتے ہوئے برٹرنڈ رسل نے کہا تھا کہ "جب تک کسی نے پنیر کو نہ دیکھا ہو وہ پنیر کے لفظ کو نہیں سمجھ سکتا"۔ لیکن مضمون نگار کہتے ہیں کہ پنیر کا معنی سراسر لسانی ہے۔جو لوگ معنی کو "نشان" کے بجائے "شئے" سے مختص کرتے ہیں ان کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پنیر کو آج تک کسی نے نہیں چکھا۔امریکی ناقد رومن جیکبسن نے "لسانی نشان" کے معنی کی تین صورتیں بیان کی ہیں:

1. Intralingual Translation
2. Interlingual Translation

3. Intersemiotic Translation

پتہ چلتا ہے کہ کسی زبان میں ترجمہ خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اصل عبارت کے حسن اور اثر پذیری تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے بعد مضمون نگار نے مذکورہ بالا تینوں اصولوں کی روشنی میں مختلف تراجم کا جائزہ لے کر ان کی خامیوں کو اجاگر کیا ہے۔ اس میں بالخصوص مذہبی تراجم کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے بعد مضمون نگار لکھتے ہیں کہ دراصل زبان کا ایک مزاج ہوتا ہے اور اس مزاج کا خیال رکھنا ہی مترجم کا اصل کام ہے۔ یہاں مزاج سے مراد زبان کی تہذیبی اور قومی روایت ہے۔

ایک زبان کے اندر کئی زبانیں ہوتی ہیں اور مختلف النوع مزاجوں کے حامل افراد کے مکالمات کو ترجمہ کرنا ایک مشکل امر ہے۔ اس لیے کہ ہر ایک کا لہجے اور مکالمے کے لیے منتخب کردہ الفاظ میں نمایاں فرق ہوگا۔ بعض قوموں کا رویہ جذباتی ہونے کی بنا پر ان کی زبان بھی ان کے اثرات کو قبول کرتی ہے جس کے سبب ایسی زبانوں میں جذبات و احساسات کی لفظی پیکر تراشی آسان ہوتی ہے لیکن علمی اور سائنسی موضوعات کا حق ادا کرنا انتہائی دشوار ہوتا ہے۔

لسانی سطح پر ترسیل و ابلاغ پر غور کریں تو پہلی بات یہ ہے کہ مصنف جو کچھ سوچتا ہے اسے من و عن لفظوں کا جامہ پہنانے سے قاصر رہتا ہے۔ سو اصل فکر لفظی پیکر میں ڈھلنے کے ساتھ ہی کم از کم ایک فیصد ویسی نہیں رہتی جیسی کہ دراصل تھی۔ اس کے بعد مضمون نگار نے لسانی سطح پر ترسیل کے غائب ہونے کی وجوہات کو متعدد مثالوں سے سمجھایا ہے۔ پھر اس کے بعد وہ محاورے کے معنی اور پس منظر کی طرف آتے ہوئے لکھتے ہیں کہ گو محاورے کا معاملہ اس قدر پیچیدہ نہیں جس قدر تلمیح اور اصطلاح کا ہے لیکن مختلف النوع علاقائی محسوسات اور تجربات بہر طور دقتیں پیدا کرتے ہیں۔ اس ضمن میں مضمون نگار نے چند مثالیں پیش کیں اور لکھا کہ محاورے اور روزمرہ کے علاوہ لفظیاتی سطح پر مغربی زبانوں کی آپس میں قربتیں ہیں جن پر ہمارا مترجم نگاہ نہیں رکھتا اور ایک متعین اصول یا پیمانہ تصور کر کے ایسی فاش غلطیوں کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے جن کی تلافی ممکن ہی نہیں ہوتی۔

مضمون کا عنوان: مترجم کی ذات اور تراجم کی کتاب شماری	
مضمون نگار: ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	**رسالہ کا نام: ماہنامہ قومی زبان کراچی**
صفحہ نمبر:24-18	جلد نمبر:58 شمارہ نمبر: 03
دورانیہ: ماہنانہ	سنہ اشاعت: مارچ، 1987
مقام اشاعت: کراچی	مطبع:
ناشر: انجمن ترقی اردو پاکستان	ایڈیٹر: ادیب سہیل

مترجم کا درجہ ہر نوع کے ایک اسلوبی فنکار سے بڑھ کر ہے۔ مترجم جو جدت کا متلاشی ہے اور تجربے کو پسند کرتا ہے تب بھی روایت کا پرستار اور فنون کی ادبی قدروں کا علمبردار رہتا ہے۔ یاد رہے کہ ہر ترجمے باطن میں کلاسیکیت کی کوئی نہ کوئی رگ جڑی ہوئی ہوتی ہے خواہ وہ پوشیدہ ہو یا مدفون ہی رہے۔ مترجم اس لیے بھی کلاسیکی ہے کہ وہ اپنی سرشت میں انسان دوست ہے۔ جو کچھ مترجم کرتا ہے اسے چند لفظوں یا چند فقروں میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں۔ ادب موجودہ صورتحال میں اچھے مترجمین کے بغیر نہیں چل سکتا بلکہ بعض صورتوں میں تو وہ تخلیق کاروں سے بھی بڑھ کر مترجمین کا ضرورت مند ہو جاتا ہے۔ شہر ادب کے باشندوں میں مترجم سب سے زیادہ بین الاقوامی شہری ہونے کا اعزاز رکھتا ہے۔ سو مترجمین کی عدم موجودگی یا قلت کا مطلب یہ ہوگا کہ ادبی روایت اپنی ہی بنائی ہوئی دیوار چین میں مقید ہو کر رہ گئی ہے۔ ہمارے ہاں روایتی طریق کار کے پابند تخلیق کار ایسی ہی دیوار چین کے حلقے یا کنویں کے اسیر ہیں۔ اس دیوار سے پرے نہ دیکھنے کا مطلب ہے کہ ادب آہستہ آہستہ اثر کرنے والی پژمردگی اور تھکاوٹ سے مرجائے گا۔ اس تھکاوٹ کو گوئٹے نے Self Boredom کہا تھا۔

جدید عہد میں کسی بھی قومی ادب کے تجدید اور احیا کی قوت کا اندازہ مترجمین کی تعداد اور قابلیت سے لگایا جاتا ہے۔ ترجمے کا عمل ادبی اور تہذیبی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ ادبی ضرورت تو یہ ہوئی کہ مختلف ادبی روایات ترجمے کی مدد سے نئے رجحانات سے آشنا ہوتی ہیں، موضوعات اور اسالیب کو پنپنے کے لیے ایک نئی فضا میسر آتی ہے۔ چوں کہ ادبی روایت بنیادی

طور پر تہذیبی روایت کا حصہ ہوتی ہے، اس لیے مختلف ادبی روایات کا اشتراک در حقیقت تہذیبی اشتراک کو سامنے لاتا ہے اور یوں مختلف تہذیبیں باہمی ربط کے سبب ایک دوسرے کے بنیادی طرز احساس سے آشنا ہو کر وسیع تر عالمی تناظر میں پھولتی پھلتی ہیں۔ مغرب میں ارنسٹ فینولوسا، آرتھر ویلی، ایزرا پاؤنڈ اور ہمارے ہاں عنایت اللہ دہلوی، محمد حسن عسکری، مظفر علی سید اور سلیم الرحمٰن نے تو ترجمے کو اپنی تخلیقی زندگی کا ایک بڑا تجربہ بنا دیا۔ ان نامور مترجمین نے دراصل ترجموں کی معرفت اپنے عہد کے دانشوروں کے سامنے ایک نیا تہذیبی پس منظر واضح کیا ہے۔

ہمارے ہاں مغربی زبانوں سے باقاعدہ کتابی صورت میں شائع ہونے والے ادبی تراجم کی تعداد 1637 ہے لیکن ترجمے مسائل کے بارے میں ہمارے ہاں بہت کم لکھا گیا ہے جب کہ کتاب شماری کا کام نہ ہونے کے برابر ہوا۔ اس کے بعد مضمون نگار نے تراجم کی چند فہارس درج کی ہیں اور آخر میں تراجم کی کتاب شماری کی تین صورتیں بتائی ہیں:

1۔ اردو میں تراجم کے آغاز سے تاحال مغربی زبانوں سے جتنے بھی تراجم ہوئے خواہ کسی بھی زبان سے ہوئے ہوں اور ان کی نوعیت جیسی بھی ہو، سب کی ایک فہرست مرتب کی جائے۔

2۔ تراجم کا انتخاب کیا جائے، جس میں رطب و یابس پر غور کرنے کے بجائے ساری توجہ اہم تراجم پر مرکوز رہے۔

3۔ کتاب شماری کے ذریعہ اردو تراجم کی عہد بہ عہد نشوونما کا جائزہ لیا جائے۔

ان میں اول الذکر طریقہ کار کو اس لیے بنیادی اہمیت حاصل ہے کہ اردو میں کتاب شماری کا کام نہ ہونے کے برابر ہے جبکہ رطب و یابس سے مستند اور اہم کام کو علاحدہ کرنے کا کام اس سے دوسرا قدم ہے۔ تیسری صورت ہر عہد کو پہچان عطا کرتی ہے اور اس کی اہمیت کم نہیں۔ لیکن یہ کام بھی اس صورت میں ممکن ہے جب کتاب شماری مکمل کر لی جائے۔

مضمون کا عنوان: **شکسپیئر کے اردو تراجم**	
مضمون نگار: خاطر غزنوی	**رسالہ کا نام: اردو نامہ**
صفحہ نمبر:38-16	جلد نمبر: شمارہ نمبر:17
دورانیہ: سہ ماہی	سنہ اشاعت: جولائی تا اکتوبر 1961
مقام اشاعت: کراچی	مطبع: ایسٹ پریس، کراچی
ناشر: ترقی اردو بورڈ، کراچی۔	ایڈیٹر: ممتاز حسن

اس مضمون میں مضمون نگار نے ولیم شکسپیئر، اس کے ڈراموں، اردو میں اس کے تراجم کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ولیم شکسپیئر شاعر اور ڈرامہ نگار تھا۔ اپنی تحریروں کی بنا پر وہ دنیا کے ہر خطے اور ہر حصے میں مقبول ہے۔ اردو میں بھی شکسپیئر کے ڈرامے اپنی دلکشی اور خصوصیات کے سبب ڈھالے جاتے ہیں۔ شکسپیئر کا اردو میں پہلا ترجمہ دراصل اس مہم کا ایک حصہ تھا جو فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی زبان کے پروفیسر جان گلکرسٹ نے اردو قواعد کی ترتیب کے سلسلے میں سر کی تھی۔ شکسپیئر کے ڈراموں کے جو تراجم ہوئے ان کی غرض و غایت انگریزی ڈراموں کی مقبولیت تھا۔ ممبئ میں بمبئ تھیٹر کے نام سے ایک عمارت تعمیر کروائی گئی تھی جہاں انگریزوں نے اپنے عروج کے پچاس سالہ زمانے میں 149 تماشے اسٹیج کیے۔ کالج کے پارسی طلبا نے اپنے بزرگوں کی نقل میں کالجوں اور اسکولوں میں مغربی ڈرامہ نگاروں کے شاہکار بالخصوص شیکسپیئر کے ڈرامے دکھانے شروع کیے۔ الفنسٹن کالج بمبئ کے طلبا نے "الفنسٹن ڈرامیٹک کلب" کے نام سے ایک کلب 1861 میں قائم کیا۔ اس کلب نے متعدد انگریزی ڈرامے پیش کیے۔ ان ڈراموں کے بعد کچھ نوجوانوں کو شیکسپیئر کے ڈراموں کے اردو ترجمے کرنے کا خیال پیدا ہوا۔

گلکرسٹ کے ترجمے کے کوئی 65 برس بعد بمبئ میں بے شمار ناٹک منڈلیوں نے شکسپیئر کے ڈراموں کے ترجمے کرا کے انہیں کھیلا۔ تھیٹر کے لیے شیکسپیئر کے کس ڈرامے کا سب سے پہلا اردو ترجمہ ہوا اس کے بارے میں حتمی معلومات نہیں

ہیں لیکن ایک خیال کے مطابق اس کا فخر جناب احسن لکھنوی کو حاصل ہوا۔ شیکسپیئر کے معلوم ترجموں کی تعداد کم و بیش ڈیڑھ سو سے زیادہ ہے۔ 1871 سے موجودہ دور تک ہر زمانے میں شیکسپیئر نے دوسرے ملکوں کے ساتھ ساتھ اردو تھیٹر پر بھی حکمرانی کی۔ پنڈت نارائن پرشاد بے تاب نے لوگوں میں ڈرامے کا ذوق پیدا کرنے کے لیے بمبئی سے "شیکسپیئر" ہی کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا۔ تھیٹر کا زمانہ گیا تو اردو فلم میں بھی شیکسپیئر نے حصہ پایا لیکن فلم سے زیادہ موجودہ دور میں ریڈیو نے شیکسپیئر کی قدر افزائی کی اور سیکڑوں اردو ترجمے بی بی سی اور آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوتے رہے۔

اس کے بعد شیکسپیئر کے منظوم ترجموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تلوک چند محروم نے بھی شیکسپیئر کے بعض ڈراموں کے اہم حصوں کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ پروفیسر محسن احسان نے بھی میکبیتھ کا منظوم ترجمہ کیا۔ شیکسپیئر کے اردو ترجمے خصوصی طور پر ڈرامے پاک و ہند کے مختلف کالجوں میں تعلیمی افہام و تفہیم کی غرض سے ہوتے رہے ہیں۔ ان میں بے شمار ترجمے کالجوں کی چار دیواریوں تک ہی محدود رہے۔ ترجمہ کا یہ سلسلہ جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گا جب تک شیکسپیئر کی لازوال شاعری لوگوں کے ذوق کی تسکین کراتی رہے گی۔

مضمون کا عنوان: **اردو میں علمی اصطلاحات**	
مضمون نگار: عبدالحق	**رسالہ کا نام: اردو**
صفحہ نمبر:28-01	جلد نمبر: شمارہ نمبر:125
دورانیہ: سہ ماہی	سنہ اشاعت: جنوری1945
مقام اشاعت: دہلی	مطبع:
ناشر: انجمن ترقی اردو(ہند) دہلی	ایڈیٹر: عبدالحق

مضمون نگار نے اس دعویٰ کے ساتھ اپنے مضمون کا آغاز کیا کہ اُردو ہی وہ واحد زبان ہے جس میں زمانۂ دراز سے علمی اصطلاحات پر غور و فکر کیا گیا اور مختلف اوقات میں اس کے اصول وضع کیے گئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ دہلی کالج کی مجلس ترجمہ نے تخمیناً 150 کتابوں کا ترجمہ کیا یا کتابیں تالیف کیں اور یہاں صرف ترجمہ ہی نہیں ہوا بلکہ اصطلاحات وضع کرنے کے اصول بھی تجویز کیے گئے جو حسب ذیل ہیں:

1۔ جب سائنس کے کسی ایسے لفظ کا مترادف اردو میں موجود نہ ہو جو سادہ خیال ظاہر کرتا مثلاً سوڈیم، کلورین وغیرہ تو وہ بہ جنسہ اردو میں لے لیا جائے۔ تاریخ میں آنے والے القاب و خطابات کے لیے بھی یہی اصول اختیار کیا جائے۔

2۔ جب سائنس کے کسی ایسے لفظ کا ہم معنی اردو لفظ موجود ہے جو سادہ خیال ظاہر کرتا ہے جیسے آئرن کے لیے لوہا، تو یہاں اردو لفظ استعمال کیا جائے۔

3۔ اگر لفظ مرکب ہے اور اس کے دونوں جز انگریزی ہیں اور دونوں میں کسی کا ہم معنی لفظ اردو میں نہیں ہے تو وہ لفظ بہ جنسہ اردو میں منتقل کر لیا جائے جیسے ہائیڈرو کلورین وغیرہ۔

4۔ اگر لفظ مرکب ہے اور اس کے دونوں اجزا کے الگ الگ مترادف اردو میں موجود ہیں تب ان دونوں مترادفات کو ملا کر ترجمہ کر لیا جائے جیسے کرانولوجی کا ترجمہ علمِ زماں۔

5۔ اگر مرکب لفظ ایسے دو مفرد الفاظ سے بنا ہے جن میں سے ایک کا مترادف اردو میں موجود ہے اور دوسرے کا نہیں ہے تو ایک انگریزی اور دوسرے اردو لفظ سے مرکب بنا لیا جائے۔

6۔ بعض الفاظ ایسے ہیں جیسے آرڈر، کلاس، جینس جن کے مترادف اگرچہ کسی نہ کسی صورت میں اردو میں پائے جاتے ہیں تاہم انگریزی الفاظ اردو میں منتقل کر لیے جائیں تو مناسب ہو گا کیوں کہ اردو میں اس قبیل کے الفاظ ایک دوسرے کے مترادف ہوتے ہیں اور اس سے اصل مفہوم کے سمجھنے میں مغالطہ پیدا ہو جاتا ہے۔

7۔ درختوں کے انواع کے نام اس نوع کے کسی ممتاز فرد یا بعض مشترک خصوصیات کی بنا پر رکھے جاتے ہیں۔ اس قاعدے کی پابندی اردو میں بھی کی جائے۔

ان اصولوں کے تذکرہ کے بعد مضمون نگار لکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا اصولوں میں اردو مترادف سے مراد ایسا لفظ ہے جو ملک کے تعلیم یافتہ اور متوسط درجے کے طبقے میں معروف ہو۔ اگر ہماری مشرقی زبانوں کی لغات میں کوئی ہم معنی لفظ نہ ملے اور پنڈتوں اور مولویوں سے پوچھنے کی ضرورت پڑے تو اس سے تو بہتر یہی ہے کہ انگریزی لفظ ہی استعمال کر لیا جائے۔ مترجم کو لفظ بہ لفظ ترجمے کی کوشش کبھی نہیں کرنی چاہیے۔ ترجمے میں سب سے بڑی بات اصل مفہوم یعنی جملے کے معنی اور مطلب کو صحیح طور سے ادا کرنا ہے چاہے اس کی ساخت کیسی ہی مختلف کیوں نہ ہو۔

مضمون کا عنوان: **زبان شناس مترجم**	
مضمون نگار: مولانا محمد اسحٰق رضوی مصباحی	**رسالہ کا نام: یادگارِ رضا**
صفحہ نمبر:32-23	جلد نمبر: شمارہ نمبر:
دورانیہ: سالنامہ	سنہ اشاعت:2009
مقام اشاعت: ممبئی	مطبع:
ناشر: رضا اکیڈمی، ممبئی	ایڈیٹر: مرتب۔غلام مصطفیٰ رضوی

اس مضمون میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے تراجم کو موضوع بنایا گیا ہے اور بحیثیت مترجم ان کی خوبیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مضمون نگار نے سب سے پہلے زبانوں کے اہمیت اور ان کے انداز و ساخت کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہر زبان کا اپنا ایک انداز ہوتا ہے ۔ اور ایک زبان کے مقابلے میں دوسری زبان کا لفظ رکھتے وقت بہت سی باریکیوں پر نظر رکھنا پڑتا ہے۔اس کے علاوہ جن دو زبانوں کے مابین ترجمہ ہو رہا ہے ان کے مفردات، مرکبات، جملوں کی ساخت کے فرق پر بہت گہری نظر ہونا ضروری ہوتا ہے۔ مضمون نگار کہتے ہیں کہ ہم نے کتاب و سنت کے بہت سے تراجم دیکھے ہیں مگر امام احمد رضا خاں بریلوی رحمتہ اللہ علیہ کے قلم سے نکلے ہوئے ترجموں کا الگ انداز ہے جن میں اصل سے مطابقت اتنے اعلیٰ درجہ میں پائی جاتی ہے کہ اس سے آگے نہایت مشکل معلوم ہوتی ہے۔

اس کے بعد انہوں نے امام احمد رضا کی پیدائش، ان کے حالاتِ زندگی اور زمانے کا ذکر کیا ہے۔اس کے بعد اس دور کی اردو اور اردو ترجموں کا تجزیہ کیا ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ اس دور کے ترجموں کی زبان میں نقل لفظ کو ترجیح دی جاتی تھی مگر امام احمد رضا کی نثر نہایت صاف اور غموض سے پاک ہے، فارسی الفاظ کو آپ اس انداز سے پیوستہ کرتے ہیں کہ وہ اردو کے ہی الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ تقدیم و تاخیر نہایت واضح ہوتی ہے ۔ قافیہ اور سجع واضح ترکیب بن جاتے ہیں اور سلاست ، وضاحت ، اختصار، عظمت، شکوہ اور تناسب اعلیٰ سطح پر موجود ہوتا ہے۔

اس کے بعد مضمون نگار اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ترجمہ میں اصلی زبان سے مطابقت اور مفہوم کی مکمل ادائیگی اور دونوں زبانوں کی مستعمل ہئیت ہی ترجمہ کو حسن اور عظمت بخشتی ہے۔ امام احمد رضا نے قرآن وسنت کے ترجموں میں ان شرائط و قواعد کا ایسا لحاظ رکھا ہے کہ آپ اس میں منفرد ہیں۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی چند خوبیاں حسبِ ذیل ہیں:

1۔ اصل عبارت سے مکمل مطابقت

2۔ ہر لفظ کے مکمل مترادف کا وجود

3۔ اردو زبان کا ترقی کردہ اور مستعمل اسلوب

4۔ بلاغت اور بیان اور صرف و نحو کے مسائل کے مطابق معنی کا انتخاب

5۔ معتبر تفاسیر کے عربی ترجمہ کا اردو میں نقل

6۔ اسلامی عقائد و سیرت اور مسلمات کی رعایت

7۔ قرآن کی محکم آیات کی تعلیم کا لحاظ

8۔ اللہ تعالیٰ، انبیائے کرام، اولیائے کرام، صالحین کے مرتبہ کے مطابق کلمات کا انتخاب

9۔ اسی مختصر عبارت اور ترجمہ میں ذہن میں گردش کرنے والے سوالات کو جواب جو اس کے اسلوب ہی سے معلوم ہو جاتا ہے

10۔ راجح تفسیر اور مقبول تفسیر کا ترجمہ میں لحاظ

بعد ازاں مصنف نے مثالوں کے ذریعہ درج بالا خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔

مضمون کا عنوان: اردو زبان میں ترجمے کے مسائل	
مضمون نگار: محمد بخش ہاشمی	**رسالہ کا نام: اخبار اردو**
صفحہ نمبر:30-26	جلد نمبر:03 شمارہ نمبر:01
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: جنوری،1986
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: ورڈ میٹ پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	ایڈیٹر: شریف کنجاھی

یہ مضمون دراصل مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے زیر اہتمام ہونے والے سہ روزہ سیمینار " اردو زبان میں ترجمے کے مسائل " کی روداد ہے جسے محمد بخش ہاشمی نے قلمبند کیا ہے۔ یہ سیمینار یکم دسمبر تا 3 دسمبر 1985 کو راولپنڈی میں منعقد ہوا تھا۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا سیمینار تھا۔ مقتدرہ کے صدر نشین ڈاکٹر وحید قریشی کے مطابق اس سیمینار کے انعقاد کا مقصد ترجمے کے مسائل کو حل کرنے کے لیے ملک بھر کے دانشوروں سے ان کی رائے طلب کرنا تھا تاکہ متفقہ فیصلوں کی روشنی میں خاطر خواہ انتظامات کیے جا سکیں اور ملک بھر میں سرکاری دفاتر میں اردو کو جلد از جلد نافذ کیا جا سکے۔ اس سیمینار کے اختتام پر چند قراردادیں پیش کی گئیں جو حسب ذیل ہیں:

1۔ ایک کمیٹی کا قیام جو ابلاغیات میں مستعمل الفاظ و اصطلاحات اور نئی ایجادات کے ناموں کے موزوں اور یکساں اردو متبادل الفاظ کی معیاری فرہنگ تیار کر کے ابلاغی اداروں کو فراہم کرے۔

2۔ ادبی انعامات کے سلسلے میں تراجم کو بھی شامل کیا جائے۔

3۔ اردو ٹیلی پرنٹرز کا جلد از جلد اجرا تاکہ اردو میں خبروں کی ترسیل کے لیے موجودہ دوہرے ترجمے کا غیر ضروری سلسلہ ختم کیا جائے۔

4۔ علمی، ادبی، سائنسی، فنی تراجم کا معاوضہ انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

5۔ ملک کی تمام جامعات میں ایم اے کی سطح پر مقالات کے سلسلے میں کسی کتاب کے خاص اجزا کے ترجمے کو بھی مقالے کے طور پر منظور کیا جائے۔

6۔ مقتدرہ قومی زبان کے دارالترجمہ کو بڑے پیمانے پر توسیع دی جائے اور اس میں جامع حوالہ جاتی کتب خانہ بھی قائم کیا جائے۔

7۔ اردو تراجم کا ایک مخصوص کتب خانہ قائم کیا جائے جس میں اردو کے تمام قدیم و جدید تراجم جمع کیے جائیں۔

8۔ مقتدرہ اہم ترین کتب کا ترجمہ اردو میں شائع کرنے کا انتظام کرے۔

9۔ حکومت کے زیر اہتمام قائم ہونے والے نئے اداروں کے نام انگریزی کے بجائے اردو میں رکھے جائیں نیز نئے منصوبوں، عہدوں اور آسامیوں کے نام بھی اردو میں رکھے جائیں۔

10۔ مختلف اداروں اور افراد کی بنائی ہوئی اصطلاحات کی معیار بندی کی جائے اور یہی اصطلاحات جملہ اردو کتب میں استعمال کی جائیں۔

11۔ ترجمے کا ایک تربیتی ادارہ، مقتدرہ قومی زبان کے زیر اہتمام قائم کیا جائے اور ملک کی تمام جامعات میں فن ترجمہ کا کورس مناسب سطح پر داخل کیا جائے۔

12۔ سرکاری افسران و اہل کاران کو تربیت کے دوران، اردو کے ان تمام الفاظ و اصطلاحات سے واقف کرادیا جائے جو مختلف انتظامی امور اور شعبوں سے تعلق رکھتے ہوں۔

13۔ انجمن ترقی اردو کی شائع کردہ انگریزی اردو لغت کو ترمیم و نظر ثانی اور کم از کم پندرہ ہزار نئے الفاظ کے اضافے کے ساتھ شائع کرنے کا فوری انتظام کیا جائے تاکہ مترجمین اور طلبا کی ایک شدید ضرورت پوری ہو سکے۔

مضمون کا عنوان: **تراجم کے مسائل**	
مضمون نگار: رابعہ سرفراز	**رسالہ کا نام: اخبارِ اردو**
صفحہ نمبر:54-52	جلد نمبر:21 شمارہ نمبر:10
دورانیہ:ماہنامہ	سنہ اشاعت:اکتوبر،2005
مقام اشاعت:اسلام آباد	مطبع: ورڈ میٹ پرنٹرز،اسلام آباد
ناشر: مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد	ایڈیٹر:سید سردار احمد پیرزادہ

مضمون نگار نے معاشرے میں ادب کے جمود کے دور میں تراجم کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ جب کسی معاشرے میں سوچ کے دھارے خشک ہونے لگیں تو وہاں کا ادب بھی یکسانیت کا شکار ہونے لگتا ہے اور اس جمود کو خاص قسم کی ذہنی اور نظریاتی فضا ہی کے ذریعہ توڑا جا سکتا ہے اور ایسی صورت حال میں غیر ملکی ادب کا مطالعہ تخلیقی عمل کی بحالی میں معاون اور مددگار ثابت ہوتا ہے۔ فکری جمود کو ختم کرنے کے لیے ایک زبان کے نظریات کا دوسری زبان میں انتقال دوررس اثرات کا حامل ہوتا ہے۔

اس کے بعد وہ مترجم کی ذمہ داریوں اور ترجمے کے اصولوں پر بات کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ مترجم کی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنے قارئین تک صحیح مفہوم پہنچائے۔ ترجمے کے لیے دو زبانوں پر قدرت ضروری ہے۔ تہذیبی سانچے کی منتقلی میں بھی احتیاط کی ضرورت ہے۔ نثر میں بالخصوص جملوں کی ساخت اور آہنگ کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ اعلیٰ ادب کے تراجم سے فنکار کی زبان میں وہ ادبی نکھار پیدا ہوتا ہے جو وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ادبی تراجم کے حوالے سے مترجم میں خاص صلاحیت کا ہونا ضروری ہے اور وہ ہے تخلیق کار کا سا تخیل۔ ایسے مقامات جہاں سادہ اور سلیس اسلوب کی ضرورت ہو وہاں مقفیٰ و مسجع انداز سے گریز کرنا ضروری ہے۔ مترجم کو اپنی انفرادیت کے اظہار کے لیے کسی دوسرے تخلیق کار کے فن پارے کو تختۂ مشق بنانے کی ضرورت نہیں۔

اس کے بعد مضمون نگار نے ادبی تراجم پر روشنی ڈالی ہے اور کہا ہے کہ ادبی تراجم کے سلسلے میں مقصد کا تعین ایک اہم مسئلہ ہے۔ معاشرتی اور علمی حوالے سے غیر اہم تخلیق کا ترجمہ خسارے کا سودا ہے۔ شعر کے ترجمے میں بہت سی مشکلات ہیں جیسے بحر، وزن اور قافیہ وردیف کے مسائل۔ اس لیے اسے آزاد فارم میں ترجمہ کرنا مناسب ہے کیوں کہ شاعری صرف قافیہ ردیف کی پابندی کا نام نہیں بلکہ اس میں اعلیٰ خیال کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ کسی فن پارے کا ترجمہ در ترجمہ مزید مشکلات کا حامل ہے۔ اگر پہلے ترجمے میں بعض اصطلاحات، الفاظ یا عبارت کے مفاہیم مبہم اور غیر واضح ہوں تو دوسرے ترجمے میں بھی اس کی مشکلات قائم رہیں گی۔ یہ بالکل ایسے ہی جیسے کہ منٹو نے روسی ادب کے اردو تراجم کیے لیکن وہ روسی زبان سے ناآشنا تھے۔ انہوں نے صرف روسی زبان کے انگریزی تراجم کو بنیاد بنایا۔ ایسی صورت میں اصل زبان تک رسائی نہ ہونے کے سبب بعض مقامات پر ابلاغ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد مضمون نگار نے شاعری کے ترجمے کے سلسلے میں اقبال کی نظم "آفتاب" کی مثال دی ہے جو شروع میں بانگ درا میں شامل تھی لیکن موجودہ نسخوں میں شامل نہیں ہے۔ اس ترجمے کا حوالہ دیتے ہوئے مضمون نگار لکھتی ہیں کہ شعر و ادب کے ترجمے میں نیم دلی کے ساتھ کم کرنے کے بجائے مکمل توجہ اور دلچسپی کی ضرورت ہے۔ عمدہ تراجم سے ایسا ادب وجود میں آسکتا ہے جو اردو زبان و ادب کے دائرے کو وسیع کرنے کے ساتھ ساتھ انسانی فکر کا بہترین ثمر ہوگا۔ مضمون کے آخر میں حواشی دیے گئے ہیں۔

مضمون کا عنوان: **اردو ترجمے کی فنی تاریخ**	
مضمون نگار: عطش درانی	**رسالہ کا نام: اخبار اردو**
صفحہ نمبر:09-06	جلد نمبر:02 شمارہ نمبر:02
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: فروری، 1985
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: ورڈ میٹ پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	ایڈیٹر: شریف کنجاھی

مضمون نگار نے سب سے پہلے اردو ترجموں کی تاریخ اور اردو کے ابتدائی ترجموں کی نوعیت پر روشنی ڈالی۔ وہ لکھتے ہیں کہ اردو میں نثری تراجم کا آغاز 1635ء سے ملا وجہی کے ترجمے "سب رس" سے ہوتا ہے۔ یہ ادبی نوعیت کا ایک بامحاورہ ترجمہ تھا جسے ایک تخلیقی شہ پارہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد مضمون نگار نے شمالی ہند میں سترہویں صدی میں ہونے والے ترجموں کی نوعیت کا جائزہ لیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ شمالی ہند میں ہونے والے زیادہ تر تراجم تصوف سے تعلق رکھتے ہیں۔ اٹھارویں صدی میں فارسی عربی کے علاوہ انگریزی سے تراجم کا آغاز بھی مذہبی کتابوں مثلاً بائبل کے ترجمے سے ہوا۔

اردو میں باقاعدہ ترجموں کا آغاز فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں 19 ویں صدی کے آغاز ہی سے ہوا۔ جہاں ترجموں کی ایک لمبی فہرست ملتی ہے ان میں ادبی علمی اور مذہبی کتابیں موجود ہیں جو زیادہ تر عربی، فارسی اور سنسکرت سے ترجمہ کی گئیں۔ ان تراجم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ کھلے ترجمے کے اصولوں پر پیش کی گئیں اور پہلے سے قدرے بہتر تراجم وجود میں آئے۔ 1882ء میں تراجم کا تیسرا دور دہلی کالج میں شروع ہوا، جو 1877ء تک رہا۔ اس میں علمی اور سائنسی کتب کے ترجمے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ حقیقت میں ان موضوعات پر یہ پہلی کوشش ہے۔ اس دور میں دہلی کالج سے باہر بھی لوگوں نے علمی اور سائنسی کتب کے ترجمے کیے۔ اس دور کی اہم خصوصیت ادبی و علمی اور سائنسی تراجم کا رجحان ہے۔

19 ویں صدی کے نصف آخر میں جو تراجم ہمارے سامنے آتے ہیں ان ڈپٹی نذیر احمد کے دو تراجم بہت اہم ہیں۔ ایک "ترجمہ قران مجید" جو اردو میں قرآن کا پہلا بامحاورہ ترجمہ ہے۔ اردو تراجم کا چوتھا دور سر سید کی سائنٹفک سوسائٹی 1862ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں سائنس اور علمی موضوعات پر ترجمہ کرنے کے لیے پہلی بار باقاعدہ مترجمین کا تقرر کیا گیا۔ اس سوسائٹی نے 40 کے قریب کتابوں کا ترجمہ کیا۔ ان کتابوں کی مجموعی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سر سید کے اس قول کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ بات دل سے نکلے اور دل پر اثر کرے یعنی کھلا ترجمہ کرنے کی کوشش کی گئی جو کہ علمی کتابوں کے لیے موزوں تکنیک نہیں ہے۔ اس کے بعد بیسویں صدی کے تراجم میں سید علی بلگرامی کی "تمدن ہند" اور "تمدن عرب" علمی ترجمے کی اہم اور خوبصورت مثالیں ہیں۔

ان کے علاوہ مولوی سعید احمد دہلوی کی کتابیں اور مولانا ظفر علی خاں کے تراجم بھی قابل ذکر ہیں۔ اردو تراجم کا پانچواں دور انجمن ترقی اردو کے قیام 1903ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس انجمن نے علمی کتابوں کے تراجم پر زیادہ زور دیا۔ 1913 میں علامہ شبلی نے دار لمصنفین اعظم گڑھ میں تراجم کا ایک الگ سلسلہ شروع کیا جس میں فلسفہ اور نفسیات کی کتابیں زیر ترجمہ آئیں۔ جب دار الترجمہ قائم ہوا اس میں باقاعدہ تنخواہ دار مترجمین نے سائنسی، انجنیری، طبّی، قانونی، عمرانی اور تعلیمی علوم پر خاصے وسیع پیمانے پر تراجم ہوئے۔ جہاں تک قرآن مجید کے ترجموں کا تعلق ہے شاہ عبدالقادر کے ترجمے کے بعد قابل قدر ترجموں میں ڈپٹی نذیر احمد، مولانا اشرف علی تھانوی، عبدالماجد دریابادی اور مولانا مودودی کے تراجم ملتے ہیں ۔ مولانا مودودی کا ترجمہ "تفہیم القرآن" بامحاروہ ترجمے کی ایک عمدہ مثال ہے جو ادبی ترجموں کے اصولوں پر بھی پورا اترتا ہے۔

مضمون کا عنوان: **اپنے ترجمے کے بارے میں**	
مضمون نگار: شان الحق حقی	**رسالہ کا نام: اخبار اردو**
صفحہ نمبر:12-09	جلد نمبر:02 شمارہ نمبر:04
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: اپریل،1985
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: ورڈ میٹ پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	ایڈیٹر: شریف کنجاھی

مضمون نگار نے مختلف زبانوں کی شاعری کا اردو میں پابند اور آزاد شاعری میں کیا جو درپن درپن کے نام سے مکتبہ اسلوبِ کراچی سے شائع ہوا۔ انہوں نے اس مضمون میں اپنے اسی ترجمے کا جائزہ لیا ہے۔ یہ نظمیں مختلف زبانوں اور مختلف ادوار سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لیے ان میں بڑی رنگارنگی پیدا ہو گئی ہے۔ موضوعات میں کافی تنوع ہے اور بعض کلام اردو کی عام شعری روایت سے ہٹ کر ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیکسپیر کے ترجمے کی طرح ان تراجم میں بھی اردو زبان کے فراواں لغات و اسالیب نے میرا ساتھ دیا ہے۔ اگر یہ تراجم کامیاب ہیں تو اس کا سہرا ہماری وسیع و بسیط، شائستہ و آزمودہ زبان کے سر ہے جس میں ہر موقع کی مناسبت سے کام کے الفاظ اور اظہار کے پیرائے مل جاتے ہیں۔ ہماری زبان میں سائنسی علوم کی بہت کمی ہے۔ ہماری نثر دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں پیچھے رہ گئی ہے۔ اس میں جدید علمی اصطلاحات اور ان کے رواج کی کمی ہے۔ کسی زبان میں علمی سرمایہ محدود ہو تو اس کا نثری سرمایہ آپ سے آپ ہلکا رہ جائے گا۔

کوئی بھی زبان معاشرے کی ترجمان ہوتی ہے۔ معاشرہ ترقی کرے تو زبان آپ سے آپ ساتھ چلتی ہے۔ اس کی استعداد قوم کی ذہنی سطح کے متوازی رہتی ہے۔ اردو کو زندگی میں پورا دخل حاصل ہوتا تو یہ اپنے وافر وسائل کے بل پر کسی سے پیچھے نہ رہتی۔ جدید سائنس کی تکنیکی اصطلاحات کو چھوڑ کر اردو زندگی کے دوسرے میدانوں میں آگے ہے۔ شعر کے میدان میں اس نے ایسی مہارت اور ایسا محاورہ پیدا کر لیا ہے کہ شاید فارسی کے علاوہ کوئی زبان اس کے قریب نہیں آتی بلکہ یہ فارسی

سے زیادہ جامعیت رکھتی ہے کیوں کہ ہندی کا رس، روایت اور لہجہ بھی اس کا اپنا ہے اور عربی سے بھی اس نے بہت سا مال مار رکھا ہے اور انگریزی سے بھی بہت کچھ سیکھا ہے۔ اردو کی اس فوقیت کا انکشاف مجھ پر ان تراجم کے سلسلے میں ہوا کہ کہیں بھی اردو کو معذور و مجبور نہیں پایا، یہ نظمیں مختلف زبانوں سے تعلق رکھتی ہیں ان کی طباعت بڑی طوالت کا باعث ہوتی۔

اردو ایک وسیع زبان ہے لیکن اب سکڑتی چلی جا رہی ہے۔ بہت سے کار آمد خوش آئند اور پر معنی الفاظ، محاورات، امثال و اصطلاحات تھیں جو شاید لغات کے تابوت میں بند رہ جائیں گی۔ بعض کا خیال ہے کہ میں ہندی الفاظ بہت استعمال کرتا ہوں ۔ دراصل ہم نے ہندی الفاظ کو جو اردو کا حصہ تھے متروک کے درجے پر پہنچا دیا ہے۔ اردو کی جیت ہی اس بات میں تھی کہ اس میں عربی فارسی کے شکوہ صلابت اور بلاغت کے ساتھ ہندی کا رس بھی سمایا ہوا ہے۔ یہ عموماً وہ الفاظ ہیں جنہیں جدید ہندی مردود قرار دیتی ہے اور اب اردو ہی ان کی آماجگاہ بن کر رہ گئی ہے۔ یہ بات بھی لائق اظہار ہے کہ ترجموں میں سب سے کٹھن فارسی شعر کا ترجمہ ہے۔ میں نے اپنے آپ کو کہیں اتنا عاجز نہیں پایا۔ اس قرابت کے باوجود جو اردو اور فارسی کے درمیان ہے اردو جملے کی ترکیب فارسی سے زیادہ طویل ہوتی ہے اور جو اختصارات فارسی میں کیے جاتے ہیں اردو میں نہیں ہوتے۔ پھر فارسی اردو کے اتنے قریب ہے کہ ترجمہ بے ضرورت نظر آتا ہے۔ دنیا کی شاعری کا افق بہت وسیع ہے اور خزانے بے پایاں۔ اس لیے یہ تراجم کا مجموعہ کسی جامعیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ پھر اردو میں یہ اب تک سب سے زیادہ متنوع پیش کش ہے۔

مضمون کا عنوان: **اشتہارات کا ترجمہ**	
مضمون نگار: عرفان علی یوسف	**رسالہ کا نام: اخبار اردو**
صفحہ نمبر:12-06	جلد نمبر:02 شمارہ نمبر:05
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: مئی، 1982
مقام اشاعت: کراچی	مطبع: المخزن پرنٹرس کراچی، پاکستان
ناشر: مقتدرہ قومی زبان، کراچی	ایڈیٹر: آفتاب حسین

اس مضمون میں اخبارات میں اشتہارات کی اہمیت، ان کے ترجمے کے اصول اور چند معروف اصطلاحات کے ترجمے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اشتہارات اخباری صنعت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بعض حالات میں تو ادارتی عملے سے زیادہ اہمیت شعبہ اشتہارات کو حاصل ہوتی ہے۔ اردو اخبارات میں بالعموم انگریزی اشتہارات چھپنے کے لیے آتے ہیں۔ اشتہار کا ترجمہ کرنے والے فرد کے لیے خبروں کے مترجم اور عام ماتحت مدیر سے کہیں زیادہ باصلاحیت ہونا ضروری ہے کیوں کہ اشتہارات کی زبان کہیں زیادہ پیچیدہ، فنی اور مشکل ہوتی ہے۔ لیکن اخبارات میں ترجمہ کا کام جس عملے سے لیا جاتا ہے وہ ترجمہ کے کام میں زیادہ مہارت نہیں رکھتا۔ وقت کی کمی اور ترجمے کی عدم دلچسپی کی بنا پر انگریزی الفاظ کو اردو املا میں لکھ دیا جاتا ہے۔ اس سے ایسی عجیب و غریب جناتی زبان وجود میں آتی ہے جسے نہ اردو کہا جا سکتا ہے نہ انگریزی۔

اشتہارات کا ترجمہ کرتے ہوئے ایک بنیادی بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ترجمہ ایسی زبان میں کیا جائے جس سے اشتہاری پیغام کا مفہوم قاری پر پوری طرح واضح ہو۔ اشتہار کا ترجمہ سلیس اور آسان زبان میں ہو اور انگریزی الفاظ کے استعمال سے پرہیز کیا جائے۔

(1) پہلا اصول یہ ہے کہ انگریزی کے کسی لفظ یا اصطلاح کا اردو متبادل موجود ہے تو انگریزی لفظ کے بجائے وہ اصطلاح یا اردو متبادل لکھا جائے۔ انگریزی لفظ اس صورت میں استعمال کیا جائے جب اس کا اردو متبادل موجود نہ ہو۔

(2) اگر انگریزی زبان کا کوئی لفظ اردو میں استعمال کرنا ضروری ہے تو اس سے اردو کے قواعد کے مطابق مزید تراکیب بنانی چاہئیں۔ بعض صورتوں میں صرف واحد کا صیغہ ہی جمع کے لیے استعمال ہو سکتا ہے مثلاً لفافے پر پانچ ٹکٹ لگے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو میں جملوں کو ٹکڑوں میں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(3) فنی زبان اور اصطلاحات وغیرہ کے سلسلے میں عام انگریزی لغات کوئی مدد نہیں دے سکتیں۔ اس کے لیے اصطلاحات کی فرہنگیں استعمال کرنا زیادہ ضروری ہے۔ اردو میں تجارت، اقتصادیات، بنکاری، فنون اور سائنس کے مختلف شعبوں میں اصطلاحات کی اب کوئی کمی نہیں۔ اردو میں یہ کام 1836 سے ہو رہا ہے۔

(4) بعض اوقات مرکب الفاظ کے ایک حصے کا ترجمہ انگریزی سے لیا جاتا ہے اور دوسرے کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے جو ترجمے کے قواعد کے اعتبار سے ایک غلط عمل ہے۔ مثلاً سرکلر لیٹر کو گشتی لیٹر لکھ دیا جاتا ہے جو غلط ہے اس کی جگہ گشتی مراسلہ ہونا چاہیے۔

(5) غیر ملکی پیمانوں، اوزان اور اعداد و شمار کا ترجمہ بھی غلط کیا جاتا ہے۔ جیسے چھ سو لاکھ یا ساٹھ ملین کی جگہ چھ کروڑ لکھنا چاہیے۔

(6) اشتہارات کے ترجمے میں لغات کا استعمال بہت ضروری ہے۔

(7) اردو اشتہارات میں انگریزی ہندسوں اور مقداروں کا استعمال کسی بھی اعتبار سے مناسب نہیں ہے۔ یہ مغرب زدگی اور احساس کمتری کی علامت ہے۔

اس کے بعد مضمون نگار نے آخر میں چند فرہنگوں کی فہرست دی ہے۔

مضمون کا عنوان: **اردو زبان میں نراجیت**	
مضمون نگار: ہلال احمد زبیری	**رسالہ کا نام: اخبار اردو**
صفحہ نمبر:18-07	جلد نمبر:02 شمارہ نمبر:03
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: مارچ،1982
مقام اشاعت: کراچی	مطبع: المخزن پرنٹرس کراچی، پاکستان
ناشر: مقتدرہ قومی زبان، کراچی	ایڈیٹر: آفتاب حسین

"اخبار اردو" بابت مارچ 1982ء میں جناب ثاقب رزمی کا ایک مضمون "اردو میں نراجیت" شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون اسی کا ایک جواب ہے۔ اصل مضمون میں "غیر ملکی شخصیات کے نام، اردو میں مستعمل انگریزی الفاظ، یائے نسبتی اور یائے مفعولی اور اصطلاحات و دیگر اہم الفاظ کے تراجم" جیسے موضوعات کو پیش کیا گیا۔ زیر نظر مضمون میں ہلال احمد زبیری نے ان موضوعات کے تحت چند وضاحتیں پیش کی ہیں:

اصطلاحات اور دیگر اہم الفاظ کے تراجم

اردو زبان میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ ایک اصطلاح کے لیے متعدد الفاظ رائج ہو گئے ہیں لیکن اس صورت حال کو وجود میں لانے کی ذمہ داری اس ادیب کی نہیں ہے جو کسی علمی کتاب کا ترجمہ کرتا ہے بلکہ اس کے ذمہ دار وہ ادارے ہیں جنہوں نے اصطلاحات کا ترجمہ کرتے وقت ایک ایک اصطلاح کے لیے متعدد الفاظ وضع کر دیے اور اس امر کی کوشش نہیں کہ ان میں سے ایک لفظ قطعیت کے ساتھ اس اصطلاح کا مترادف قرار دے دیا جائے۔ اس صورتحال کو سمجھنے کے لیے ہمیں اردو زبان میں اصطلاح سازی کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کو پیش نظر رکھنا ہو گا۔ انگریزوں کے عہد حکومت کے ابتدائی دور میں جب انگریزی زبان کو سرکاری مقاصد کے لیے مدارس میں جاری کیا گیا تو ایک اچھا خاصا انگریزی داں طبقہ پیدا ہو گیا۔ 1857

ء کی جنگ آزادی سے قبل ہی چند نمایاں ہستیوں کو اس ضرورت کا احساس ہوا کہ انگریزی زبان کی علوم و فنون کی کتابوں کو اردو میں منتقل کیا جائے۔ شروع میں یہ کام انفرادی تھا جو بعد میں اجتماعی طور پر اداروں کے تحت ہونے لگا۔ پھر دہلی کالج میں مجلس ترجمہ ہوئی اور اس کے تحت اصطلاح سازی کا کام بھی شروع ہوا۔ لیکن 1857 کی تباہ کاریوں میں یہ کالج بھی برباد ہو گیا۔ بعد ازاں سر سید کی علی گڑھ تحریک شروع ہوئی اور سائنٹفک سوسائٹی کے تحت کتابیں ترجمہ ہونے لگیں اور چونکہ یہاں اصطلاح سازی کا کوئی باقاعدہ نظم موجود نہ تھا اس لیے مترجمین اہم الفاظ کا ترجمہ اپنی صوابدید کے مطابق کرنے لگے۔

پھر 1915ء میں ریاست حیدر آباد کی خصوصی توجہ سے عثمانیہ یونیورسٹی وجود میں آئی اور اس میں ایک مجلس ترجمہ قائم کی گئی۔ یہاں وضع اصطلاحات کی بھی ایک مجلس قائم تھی جس نے دہلی کالج کے اصولوں کو سامنے رکھ کر اصطلاح سازی کے جدید اصول وضع کیے۔ اس وقت جو اصطلاحات دستیاب ہیں وہ زیادہ تر ان ہی اصولوں پر مبنی ہیں۔ تشکیل پاکستان کے بعد یہ کام ہونا چاہیے تھا لیکن نہیں ہو سکا۔ بعد میں کراچی یونیورسٹی نے تراجم کے علاوہ اصطلاح سازی کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اور مختلف علوم کے لیے الگ الگ فرہنگیں شائع کیں۔ لیکن اکثر اصطلاحات کے ترجمے متعدد الفاظ سے کیے گئے ہیں۔

غیر ملکی شخصیات و مقامات کے نام

دنیا کی معروف شخصیات اور اہم مقامات کو اردو زبان میں یکسانیت کے ساتھ لکھنے کا مسئلہ اصطلاحات کے مسئلہ سے مختلف ہے۔ اس کے لیے کسی ادارہ کے قیام کی ضرورت نہیں۔ انگریزی زبان کی لغات میں اہم شخصیات و مقامات کے ہجوں اور تلفظ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہ کام نشر و اشاعت کے اداروں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ اردو میں بھی اسے اسی پیمانے پر انجام دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس کے لیے کسی تجارتی ادارے کو "اسماء الرجال" اور "اسماء البلاد" کے عنوانات سے کتابیں شائع کرنی چاہئیں۔

مضمون کا عنوان: **مترجمین اور تراجم**	
ضمون نگار: ترجمہ: عطش درانی	**رسالہ کا نام: اخبار اردو**
صفحہ نمبر:19-15	جلد نمبر:06 شمارہ نمبر:01
دورانیہ: ماہنامہ	سنہ اشاعت: جنوری 1989
مقام اشاعت: اسلام آباد	مطبع: ورڈ میٹ پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	ایڈیٹر: شریف کنجاھی

فن ترجمہ کے لیے یونیسکو نے جو سفارشات اپنے اجلاس عام منعقدہ نیروبی 22 نومبر 1976ء میں منظور کیں اس کا ترجمہ اس مضمون میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ سفارشات حسبِ ذیل ہیں:

تعریفات اور حد اطلاق:

الف۔ ترجمہ کی اصطلاح ادبی، سائنسی و تکنیکی نگارشات کی ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقلی کو ظاہر کرتی ہے۔

ب۔ مترجم کی اصطلاح ادبی، سائنسی و تکنیکی نگارشات کی ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے والے کو ظاہر کرتی ہے۔

ج۔ صارف کی اصطلاح ان افراد یا قانونی حقیقت رکھنے والوں کو ظاہر کرتی ہے جن کے لیے ترجمہ کیا جارہا ہو۔

مترجمین کی عمومی قانونی اہمیت:

رکن ممالک مترجمین کو ان کے تراجم کے حوالے سے ترجمہ شدہ نگارشات کے اصل مصنفین کے حقوق کو ضرر پہنچائے بغیر انہی تحفظات سے سرفراز کریں جن سے اس بین الاقوامی کاپی رائٹ کنونشن کے تحت جس کے وہ رکن ہیں اور یا ان کے قومی قانون کے تحت مصنفین کو سرفراز کیا جاتا ہے۔

مترجمین کو مہیا تحفظ کے عملی اطلاق کی یقین دہانی کے لیے اقدامات:

1۔ یہ مستحسن ہوگا کہ مترجم اور صارف کے درمیان معاہدہ عمل میں آئے۔

2۔ یہ معاہدہ، مترجم کو جائز معاوضہ فراہم کر سکے، مترجم اگر تنخواہ دار نہ ہو تو اسے پیشگی رقم ادا کرے، ترجمے کا استعمال حد سے زیادہ ہو تو اسے اضافی ادائیگی کر سکے۔

مترجمین کی تربیت اور شرائط کار:

1۔ رکن ممالک کو یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ ترجمہ ایک آزاد فن اور مضمون ہے جس کی تعلیم زبان کی تدریس سے الگ ہونی چاہیے اور یہ کہ اس فن میں خصوصی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

2۔ رکن ممالک کو ایسے مراکز اصطلاحات قائم کرنے چاہئیں جن میں اصطلاحات سازی، اس سے متعلق معلومات پہنچانا اور ان کی معیار بندی کرنا شامل ہے۔

3۔ پیشہ ورانہ تنظیموں کے تعاون سے رکن ممالک کو مختلف ممالک میں مترجمین کا تبادلہ کرنا چاہیے۔

4۔ معیار ترجمہ کے تحت درج ذیل اصولوں پر زور دینا چاہیے:

الف۔ مترجمین کو اپنا کام مکمل کرنے کے لیے خاطر خواہ وقت ملنا چاہیے۔

ب۔ مترجمین کو ایسی دستاویزات ملنی چاہیے جو ترجمہ طلب متن کو سمجھنے یا مسودہ لکھنے میں مدد دے سکے۔

ج۔ بطور عمومی قاعدہ یہ بات ملحوظ رہے کہ ترجمہ اصل متن سے ہی کیا جائے۔

د۔ مترجم کو جہاں تک ممکن ہو سکے اپنی مادری زبان میں ترجمہ کرنا چاہیے۔

ترقی پذیر ممالک:

ان سفارشات میں متعین کردہ اصول اور معیار ترقی پذیر ممالک میں بھی اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

مضمون کا عنوان: **اصطلاحات کے تراجم کی اہمیت**	
مضمون نگار: حبیب صدیقی	**رسالہ کا نام: اخبار اردو**
صفحہ نمبر:24-23	جلد نمبر:03 شمارہ نمبر:05
دورانیہ:ماہنامہ	سنہ اشاعت: مئی،1986
مقام اشاعت:اسلام آباد	مطبع: ورڈ میٹ پرنٹرز،اسلام آباد
ناشر: مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد	ایڈیٹر:شریف کنجاھی

اس مضمون میں مضمون نگار نے انگریزی میں اصطلاحات کو جوں کا توں رکھنے کی موقف کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ عربی اور فارسی زبان سے اصطلاحات لی جاسکتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عربی اور فارسی دنیا کی قدیم اور آفاقی زبانیں ہیں جن کی بدولت دنیائے علم وادب میں بہت ترقی ہوئی اور اب تک اردو میں علم وادب اور سائنس کے مضامین کی لاکھوں کتابوں کا جو اضافہ ہوا ہے وہ ان ہی زبانوں کا مرہون منت ہے۔ چنانچہ اصطلاحات کی اہمیت کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مقتدرہ نے اب تک اصطلاحات کی ساٹھ کتابیں اور اکیس پمفلٹ شائع کیے ہیں اور حکومت کے بارہ محکموں میں تیس سے اسی فیصد کام اردو میں ہونے لگا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام اس وقت تک انجام نہیں دیا جاسکتا تھا جب تک مختلف نوع کی اصطلاحات نہ بنائی جائیں۔ اس حوصلہ افزا پیش رفت کے باوجود کچھ حلقوں سے اس کام کی مخالفت افسوس ناک ہے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ مغربی اثرات سے اس قدر متاثر ہے کہ اگر مخالفت بند نہیں کرتا تو گویا وہ سب کچھ ہاتھ سے نکل جائے گا جو موجودہ ترقی یافتہ دور میں حاصل ہوا ہے۔ بغیر اردو اصطلاحات کے قومی زبان میں کام کرنا انتہائی دشوار ہے اور اس کے بغیر یہ کام تو انگریزی بھی انجام نہیں دے سکتی اس لیے کہ عام آدمی انگریزی نہیں جانتا اور دفتری کاموں میں وہ انگریزی داں کا محتاج ہے۔

انگریزی کی بدولت دشواریوں میں اضافہ ہی ہوتا چلا جارہا ہے اس لیے کہ اس زبان پر اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کی اجارہ داری ہے اور عام آدمی اتنی بھی تعلیم حاصل نہیں کر سکتا کہ وہ انگریزی میں حساب کتاب کر سکے۔ یعنی خود ہم نے ایک ایسی زبان کو اپنے پر مسلط کر لیا ہے۔ ورنہ چین، جاپان وغیرہ نے اس زبان سے اسی حد کت استفادہ کیا ہے جس حد تک ضرورت ہوئی۔ لیکن ترقی کی منزلیں وہ اپنی قومی زبان میں طے کر رہے ہیں اور صنعت و حرفت کے میدان میں وہ کہیں کہیں مغربی ممالک سے بھی آگے ہیں۔ ایک بات جو سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ کہ سائنس اور ٹکنالوجی میں جب بنیادی چیزوں کا علم ہو چکا ہے تو کیا ہم نے یہ طے کر رکھا ہے کہ صرف انگریزی زبان میں آئندہ ترقی کر سکتے ہیں اور دوسری زبانیں اس بات کی اہل نہیں۔ حقیقت میں یہی نظریات ہیں جن کی بناپر ہم اپنی قومی زبان میں اردو اصطلاحات کا کام کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن ایک غور طلب بات یہ ہے کہ خود انگریزی زبان بھی اپنے ارتقائی مراحل سے گزر رہی ہے اور جدید سائنس اور ٹکنالوجی بدولت اس میں جو نئے نئے الفاظ کا روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے اور نئی نئی اصطلاحیں وجود میں آرہی ہیں جن کا انگریزی زبان اور ادب سے کوئی تعلق نہیں ان ہی میں زیادہ تر اصطلاحیں خود ساختہ ہوتی ہیں جو فنی نوعیت کی ہیں اور ضروریات زمانہ کے ساتھ مقبول عام ہوتی جارہی ہیں لیکن اگر آپ ان کے معانی کسی ڈکشنری میں تلاش کرنا چاہیں تو نہ مل پائیں گے بلکہ جہاں ایسی اصطلاحیں موجود ہیں وہاں کے معانی سمجھانے کے لیے تفصیل اور تمثیل سے کام لیا گیا ہے اور ایک لمبا چوڑا ڈسکرپشن لکھا جاتا ہے۔

اردو اپنے ارتقائی مراحل طے کر رہی ہے اور نہ صرف انگریزی الفاظ استعمال کر رہی ہے بلکہ دوسری زبانوں کے الفاظ بھی سمیٹ رہی ہے لیکن ضمناً اردو جن زبانوں سے مل کر بنی ہے ان ہی سے الفاظ لے کر اصطلاحیں بنائی جارہی ہیں اور وہ ہیں عربی، فارسی، ہندی (پراکرت) ۔ اگر یہ زبانیں فرسودہ اور غیر ترقی یافتہ ہوتیں تو ان میں جدید اصطلاحات کیسے مل جاتیں ۔ اندازہ لگایے کہ بنی امیہ کے دور سے خلفاء عباسیہ تک تمام بڑی بڑی زبانوں کے علم و ادب اور فنون وغیرہ کے ترجمے عربی اور فارسی زبانوں میں ہوتے رہے ہیں اور یونانی زبان جو انگریزی طبّی اصطلاحات کا جو لا ینفک ہے اس قدیم یونانی زبان کے الفاظ پر مشتمل ہے جس کا عربی اور فارسی دونوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ کیا ہم انگریزی کی طرح ایسی اصطلاحیں جن کو ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہوں نہیں بنا سکتے۔

☆☆☆

باب پنجم

حاصل مطالعہ

حاصل مطالعہ

دور جدید میں علم کے بے انتہا پھیلاؤ نے اس بات کو مشکل بنادیا کہ ہر شخص کی پہنچ علم کے ہر گوشہ اور میدان تک ہو۔ چنانچہ اختصاص (Specialisation) کا دور شروع ہوا۔ ہر شعبہ میں بے پناہ ترقی کی بناپر علم کا ایک بحر بے کنار تخلیق ہوا جس تک جلد اور باآسانی رسائی کے لیے کئی فن وجود میں آئے۔ اشاریہ سازی بھی اسی طرح کا ایک فن ہے۔ اس میں بالعموم اخبارات، رسالوں اور کتابوں میں مذکور مضامین، شخصیات، مقامات، اسما، تبصرہ جات، اداریوں اور دیگر معلومات کو کسی مخصوص ترتیب جیسے الفبائی یا ابجدی، موضوع وار، سال یا ماہ وار یا مضمون نگاروں کے ناموں کے حساب سے مرتب کیا جاتا ہے۔ اب یہ بات انتہائی عام ہوگئی ہے کہ کتاب میں موجود انسانی ناموں، اہم مقامات اور بعض اوقات اہم موضوعات کے اشاریہ کتاب کے آخر ہی میں شائع کردیا جائے۔ بازار میں ایسے بہت سے اشاریے دستیاب ہیں جو اردو زبان کے رسائل و جرائد پر مشتمل ہیں۔

اشاریہ سازی کی بڑی اہمیت ہے۔ اس سے ایک عام قاری اور مصنف کو سہولت فراہم ہوتی ہے، اس کا وقت مختلف رسالوں اور جرائد کی تلاش میں ضائع نہیں ہوتا، وہ بکھرے ہوئے اہم تصانیف اور مضامین میں سے فوری اپنے ہدف کو تلاش کرلیتا ہے۔ جہاں تحقیق کے ضمن میں کتابوں کی اپنی اہمیت ہے وہیں رسائل و جرائد میں چھپنے والے مضامین بھی کسی سے کم نہیں ہوتے۔ جہاں کوئی کتاب بمشکل چند موضوعات کا احاطہ کرتی ہے وہیں رسائل و جرائد میں چھپنے والے مضامین انتہائی کم صفحات میں کئی متنوع موضوعات اور اصناف سخن کا احاطہ کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں جس سے کسی قاری یا محقق کو اس شعبہ علم کی وسعت و نوعیت کو سمجھنے میں زبردست مدد ملتی ہے۔ کبھی کبھار ایک مضمون اپنے مضمون نگار کی علمیت کی بناپر کئی کتابوں پر بھاری ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں رسائل میں بدلتے وقت کے بدلتے تقاضوں کو سامنے رکھ کر مضامین لکھے جاتے ہیں جس کی بناپر یہ اس شعبۂ علم کی تبدیل ہوتی صورتحال کو بھی پیش کرتے ہیں اور اس لحاظ سے تحقیقی مواد کا ایک

اہم ذریعہ بن جاتے ہیں اور چونکہ ان مضامین کے مضمون نگار مختلف ہوتے ہیں اس لحاظ سے اس شعبہ علم کے مختلف گوشوں اور ان پر مختلف زاویوں سے متنوع تبصرے حاصل ہوتے ہیں جو متنوع موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں اس لحاظ سے بھی یہ قاری کے علم میں گراں قدر اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

چنانچہ رسائل و جرائد میں شائع مضامین کی مذکورہ بالا اہمیت کی بناء پر یہ ضروری ہے کہ ان کی اشاریہ سازی لازمی طور پر کی جائے تاکہ عام قاری سے لے کر مصنف، مضمون نگار اور محقق کو علم کے سوتوں تک پہنچنے میں رہنمائی حاصل ہو۔ اسی لحاظ سے میں نے بھی اس کام کا بیڑہ اٹھایا اور اردو ادب کے ایک نظر انداز شدہ موضوع یعنی "علم ترجمہ" کے مضامین کی اشاریہ سازی کو اپنی تحقیق کا موضوع منتخب کیا۔ دوران تحقیق مجھے پتہ چلا کہ اردو میں شخصیات اور رسائل و جرائد کے تو اشاریے موجود ہیں لیکن کسی شعبۂ علم کے مضامین کا اشاریہ مجھے نہیں ملا۔ ابتداء میں میرا منصوبہ تھا کہ ہندوستان کی مشہور لائبریریوں کا دورہ کر کے وہاں موجود تمام اہم اردو رسائل و جرائد میں علم ترجمہ کے موضوع پر رقم شدہ مضامین کو فہرست کو جمع کر دوں تاہم جب میں نے اس کام کو شروع کیا تو پتہ چلا کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ اس لیے کہ کئی لائبریریوں میں جہاں کیٹلاگ میں کتابوں کے نام موجود ہیں وہاں وہ کتابیں لائبریری سے غائب ہیں اور اس کے علاوہ اردو کے تمام موقر رسائل و جرائد ضروری نہیں تھا کہ چند لائبریریوں میں دستیاب ہو جائیں۔ اس لیے کہ ان رسائل و جرائد کی تعداد ان گنت ہے اور ساتھ ہی ان میں سے کئی اب بند بھی ہو چکے ہیں اور ان کی پرانی متعلقہ فائلیں ٹھیک ٹھاک حالت میں دستیاب ہونا بھی ایک مشکل امر تھا۔ تب مجھے اس کام کی دشواری کا اندازہ ہوا۔ تاہم اس کے باوجود میں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ اپنی تحقیق کے دوران انٹرنیٹ پر مختلف رسائل و جرائد کی تلاش کے دوران میرا سامنا ریختہ ویب سائٹ سے ہوا اور اس نے میری مشکل بڑی حد تک آسان کر دی جیسا کہ اس پر بے شمار قدیم و جدید رسائل و جرائد اپ لوڈ شدہ ہیں اور روز بروز ان کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ میں نے اس پر موجود تمام رسائل و جرائد کو کھنگال کر اپنے موضوع کے تعلق سے مضامین کو یکجا ء کرنا شروع کر دیا۔ دوران تحقیق میرے مشاہدے میں یہ بات آئی کہ گو کہ یہ تمام مضامین علم ترجمہ سے متعلق ہیں لیکن اس میدان میں بھی یہ مختلف و متنوع موضوعات کا احاطہ کر رہے ہیں جن کا تذکرہ تحقیق میں ضروری تھا تاکہ بعد میں یہ تحقیق کسی قاری، مصنف، مضمون نگار اور محقق کی مدد کا باعث بن سکے چنانچہ میں نے اپنے مشفق گائیڈ محترم کے مشورہ سے ہر مضمون کا خلاصہ بھی لکھنا شروع کیا تاکہ قاری کو پورا مضمون پڑھنے کے بجائے صرف ایک صفحے سے ہی مضمون کے موضوعات کا اندازہ ہو جائے۔ ان میں سے کئی موضوعات ایسے ہیں جن پر ابھی تک کوئی باقاعدہ کتاب نہیں لکھی گئی اور علم

ترجمہ کا کوئی بھی شاگرد ان موضوعات سے صرف نظر کر کے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اب ایک عام طالب علم سے ان موضوعات سے گزرنے کے لیے اتنے سارے رسائل و جرائد تلاش کر کے انہیں پڑھنے کی توقع نہیں کی جاسکتی چنانچہ ایسے علم ترجمہ کے کسی بھی طالب علم کے لیے میری یہ تحقیق انتہائی کار آمد ثابت ہو گی۔

دوران تحقیق مجھے ایسے کئی موضوعات پر سیر حاصل مواد ملا جو اب تک میری نظر سے نہیں گزرے تھے۔ ان کے علاوہ علم ترجمہ کے عمومی موضوعات پر بھی کافی تشفی بخش مواد ملا، کئی علمی بحثوں سے سامنا ہوا اور رفتار زمانہ کی تبدیلیوں کی وجہ سے ابھرنے والے نئے مسائل اور ان کا حل وغیرہ بھی نظر سے گزرے۔ ان مضامین میں شامل چند موضوعات حسبِ ذیل ہیں۔

ترجمہ کی تعریف

ترجمہ کی اہمیت

ترجمے کے ادارے جیسے فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، دہلی ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی، جامعہ عثمانیہ، انجمن ترقی اردو، اردو لغت بورڈ، اردو سائنس بورڈ، شعبہ تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی اور ادارہ فروغ قومی زبان وغیرہ

ترجمہ کے اداروں کی تاریخ

ترجمہ کے اداروں کی ضرورت

ترجمے کے تقاضے

ترجمے کے بنیادی اصول

مترجم کی ذمہ داریاں

ترجموں میں اصطلاحات کے مسائل اور ان کا حل

اصطلاحات میں یکسانیت

مختلف شعبہ ہائے علوم کے تراجم میں اصطلاحات کا عمل و دخل

اصطلاحات سازی کی اہمیت

اصطلاحات سازی کے اصول

اردو میں اصطلاحات سازی کی تاریخ

کمپوزنگ کے مسائل

اردو کو سرکاری زبان بنانے کے لیے تراجم کی ضرورت

تراجم کے تئیں اہل زبان کا رویہ

انگریزی سے مغلوب ہو جانے کی روش کے فوائد و نقصانات

ترجمے کے نظریات

انسانی تہذیب کے ارتقا میں تراجم کا کردار

ترجموں میں محاورات، تشبیہات اور استعارت کے مسائل

ترجموں میں ضرب الامثال کے مسائل

گلوبلائزیشن اور ترجمہ

مشینی ترجمہ

ترجمے کے اقسام، طریقے اور تکنیک

نثری اور منظوم ترجمہ

اردو زبان میں ترجمے کی تاریخ

ترجمہ کے پھیلاؤ میں مذہبی کتب کا کردار

ترجمہ نگاری کا فن

فن ترجمہ: اصول و مبادی

ترجمہ نگاری کے حدود اور امکانات

ترجمہ کی تدریس

تدریس ترجمہ کا نصاب

ترجمہ میں مداخلت (تحریف و تغیر)

اردو میں فنی و سائنسی تراجم

مختلف تہذیبوں کے عروج میں تراجم کا کردار

ترجمہ اور ثقافت

صحافتی، دفتری، قانونی، علمی، سائنسی اور ادبی تراجم کے مسائل

موجودہ طرز معاشرت اور ترجمہ

ترجمہ بحیثیت تہذیبی اور لسانی مفاہمہ

ترجمے کے عملی مباحث

ترجمہ اور لسانیات

منظوم ترجمہ کا فن

مترادفات کا ترجمہ اور مسائل

ترجمے کی تجرید

ادبیات عالم میں ترجمے کی روایت

ترجمے کے مسائل اور مشکلات وغیرہ

علم ترجمہ پر مضامین کی تلاش کے دوران میں نے پانچ ہزار سے زائد رسالوں کا جائزہ لیا اور ان میں سے باسٹھ مضامین کا تفصیلی اشاریہ تیار کیا۔ دوران تحقیق مجھے محسوس ہوا کہ کسی بھی موضوع کے متعلق تحقیق میں صرف اس موضوع کی کتابیں یا مخطوطات ہی کار آمد نہیں ہوتے بلکہ اس موضوع سے متعلق ان گنت مضامین ہوتے ہیں جو مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہوتے ہیں اور ان تک ایک محقق کی رسائی مشکل ہوتی ہے ایسے میں اگر ان کا موضوعاتی اشاریہ تیار ہو جائے تو پھر کیا کہنے، محقق کے لیے الہ دین کا چراغ ہاتھ آجاتا ہے، وہ ایک ایسے بحر ذخار سے ہمکنار ہو جاتا ہے جہاں اسے علم و فن کے ہر موتی تک دسترس حاصل ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ، محقق کو رسائل و جرائد میں شائع شدہ مضامین سے موضوع کے بین شعبہ جاتی نوعیت و وسعت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ہر محقق کے لیے عملی

طور پر یہ ممکن نہیں کہ وہ دنیا بھر میں چھپنے والے تمام رسائل تک رسائی حاصل کر سکے اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ وہ ان تمام کو پڑھ سکے چنانچہ اس صورت میں رسائل و جرائد کا موضوعاتی اشاریہ اس کے لیے انتہائی مفید ثابت ہوتا ہے جن کی مدد سے وہ ان رسائل و جرائد تک رسائی حاصل کر سکتا ہے جس میں اس کے اپنے تحقیقی موضوع پر مضامین شائع ہوئے ہوں۔ جہاں تک اردو زبان کی بات ہے، پچھلے ڈیڑھ سو سال سے تقریباً برصغیر کے ہر ضلع سے مختلف رسالے و جرائد شائع ہو رہے ہیں جن کی موجودہ تعداد لاکھوں میں پہنچتی ہے ایسے میں کسی محقق کے لیے ان سے استفادہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ان رسائل و جرائد کا اشاریہ نہ ترتیب دیا جائے۔ اس لحاظ سے بھی اشاریے کی اپنی اہمیت و افادیت ہے۔ گو کہ فی زمانہ بہت سے رسائل و جرائد کی کاپیاں آن لائن دستیاب ہیں لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ ہونے سے ان سے استفادہ بہت مشکل ہے۔ پھر اشاریہ سازی کی بھی اپنی مشکلات ہیں۔ اشاریہ مرتب کرنے والوں کے سامنے ہمیشہ یہ سوال رہتا ہے کہ کن معلومات کو لیا جائے اور کن معلومات کو چھوڑ دیا جائے، پھر یہ کس محقق کے لیے کون سی معلومات کارآمد ہوں گی وغیرہ۔ چنانچہ اشاریہ سازی اپنے مرتبین کی ذہانت و دانشمندی کا بھی امتحان ہوتا ہے۔ ابھی تک چونکہ اردو زبان میں اشاریے کا بہت کم کام ہوا چنانچہ اس میں نقوشِ راہ بھی کم ملتے ہیں اور اشاریہ سازی ایک انتہائی بوجھل کام بن جاتی ہے۔ زیر نظر تحقیق میں، میں نے درج ذیل معلومات ایک جدول کی شکل میں فراہم کیں تاکہ قاری یا محقق کو فوری طور پر کسی رسالے، جریدے میں شائع شدہ مضمون سے متعلق معلومات دستیاب ہو جائیں۔

☆☆☆

کتابیات

کتابیات

1) نبلیٰ پیرزادہ، ''ترجمے کے غور طلب امور اور مسائل''اخبار اردو، جلد نمبر ۳۴، شمارہ نمبر ۱۲،۱۱۔ سنہ اشاعت، نومبر، دسمبر ۲۰۱۲۔

2) مشتاق احمد قادری، ڈاکٹر، ''ترجمہ کے چند نظری مباحث''اردو ریسرچ جرنل، شمارہ نمبر ۱۳، سنہ اشاعت، جنوری تا مارچ، ۲۰۱۸۔

3) خلیق انجم ''اردو ترجمے کا ارتقاء''اخبار اردو، جلد نمبر ۳۵، شمارہ نمبر ۲،۱۔ سنہ اشاعت، جنوری، فروری ۲۰۱۷۔

4) مناظر عاشق ہرگانوی، '' ترجمہ نگاری کا فن''اخبار اردو، جلد نمبر ۳۳، شمارہ نمبر ۲،۱۔ سنہ اشاعت، جنوری، فروری ۲۰۱۵۔

5) خادم علی ہاشمی، '' اردو میں فنی اور سائنسی تراجم''اخبار اردو، جلد نمبر ۳۶، شمارہ نمبر ۷، سنہ اشاعت، جولائی ۲۰۱۸ ۔

6) اورنگ زیب اعظمی ''عباسی دور میں ترجمے کی سرگرمیاں''معارف، جلد نمبر ۱۷۶، شمارہ نمبر ۱، سنہ اشاعت، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۵۔

7) محبوب خان ''مشینی ترجمہ کار: مبنی بر امثلہ و مصنوعی ذہانت'' اخبار اردو، جلد نمبر ۲۶، شمارہ نمبر ۷، سنہ اشاعت، جولائی ۲۰۰۹۔

8) احمد امتیاز، ڈاکٹر ''اردو میں ادبی ترجمے کی روایت''اردو ریسرچ جرنل، جلد نمبر ۲، شمارہ نمبر ۱، سنہ اشاعت، جنوری تا مارچ ۲۰۱۵۔

9) سید احسان الرحمان، ڈاکٹر '' ادبی ترجمہ''معارف، جلد نمبر ۱۸۰، شمارہ نمبر ۳، سنہ اشاعت، ستمبر ۲۰۰۷۔

10) عطش درانی، ڈاکٹر ''اردو اصطلاحات سازی: ایک نظر واپسیں'' دریافت، شمارہ نمبر ۹، سنہ اشاعت، جنوری ۲۰۱۰۔

11) عظمیٰ اجمل '' اردو اصطلاحات سازی: روایت و مستقبل''اخبار اردو، جلد نمبر ۳۶، شمارہ نمبر ۷، سنہ اشاعت، جولائی ۲۰۱۸۔

12) عطش درانی، ڈاکٹر ''ترجمے اور اصطلاح سازی''اخبار اردو، جلد نمبر ۱۰، شمارہ نمبر ۱۱، سنہ اشاعت، نومبر ۱۹۹۳۔

13) سلیم فارانی ''اصطلاحی غور و فکر''اخبار اردو، جلد نمبر ۵، شمارہ نمبر ۷، سنہ اشاعت، جولائی ۱۹۸۸۔

14) قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی ''اردو میں دوسری زبانوں سے ترجمے کی روایت اور مسائل''اردو دنیا، جلد نمبر ۱۵، شمارہ نمبر ۳، سنہ اشاعت، مارچ ۲۰۱۳۔

15) محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، ''اصطلاحات سازی۔ ضرورت و اہمیت''دریافت، شمارہ نمبر ۹، سنہ اشاعت، جنوری ۲۰۱۰۔

16) فاخرہ نورین، ڈاکٹر، ''سوانح اور خاکے کا ترجمہ فن اور مسائل''دریافت، شمارہ نمبر ۱۴، سنہ اشاعت، جنوری ۲۰۱۵۔

17) خالد اقبال یاسر، ڈاکٹر، ''دفتری اردو میں ترجمے کی مشکلات'' دریافت، شمارہ نمبر ۱۶، سنہ اشاعت، جون تا دسمبر ۲۰۱۶۔

18) پرویز احمد اعظمی، حافظ صفوان محمد چوہان، ''اردو میں مشینی ترجمے کے مسائل'' قومی زبان، جلد نمبر ۲، شمارہ نمبر ۱۲۔۱، سنہ اشاعت، دسمبر تا جنوری ۲۰۱۰۔۲۰۱۱۔

19) ارشاد نیازی، ''عصر جدید میں ترجمے کی افادیت''اردو دنیا، جلد نمبر ۱۵، شمارہ نمبر ۸، سنہ اشاعت، اگست ۲۰۱۳۔

20) سید احسان الرحمٰن، ''فن ترجمہ نگاری: حدود اور امکانات''اردو دنیا، جلد نمبر ۸، شمارہ نمبر ۸، سنہ اشاعت، اگست ۲۰۱۶۔

21) خالد ندیم، ڈاکٹر، ''ترجمے کا فن''اخبار اردو، جلد نمبر ۲۶، شمارہ نمبر ۲، سنہ اشاعت، فروری ۲۰۰۹۔

22) اسد رضا، ''صحافتی ترجمے کے مسائل''اردو دنیا، جلد نمبر ۱۲، شمارہ نمبر ۳، سنہ اشاعت، مارچ ۲۰۱۰۔

23) محمد نصیر احمد عثمانی، ''دار الترجمہ کی مجالس وضع اصطلاحات''مجلہ عثمانیہ، شمارہ نمبر ۶۲، سنہ اشاعت، ۱۹۵۹۔۱۹۶۰۔

24) مولوی عبدالحق، ڈاکٹر، ''دارالترجمہ حیدرآباد دکن اور وضع اصطلاحات'' اخبار اردو، جلد نمبر ۴، شمارہ نمبر ۹، سنہ اشاعت، ستمبر ۱۹۸۷ء۔

25) عطش درانی، ڈاکٹر، ''فن ترجمہ اصول و مبادی'' اخبار اردو، جلد نمبر ۲، شمارہ نمبر ۱، سنہ اشاعت، جنوری ۱۹۸۵ء۔

26) ابو شہیم خان، ڈاکٹر، ''موجودہ طرز معاشرت اور اردو ترجمہ'' اردو ریسرچ جرنل، شمارہ نمبر ۱۲، سنہ اشاعت، اکتوبر، دسمبر ۲۰۱۷ء۔

27) ابو شہیم خان، ڈاکٹر، ''ترجمہ: ایک تہذیبی و لسانی مفاہمہ'' اردو ریسرچ جرنل، شمارہ نمبر، سنہ اشاعت، ستمبر، دسمبر ۲۰۱۶ء۔

28) سلمان فیصل، ''ترجمے کے فنی اور عملی مباحث'' اردو ریسرچ جرنل، شمارہ نمبر ۷، سنہ اشاعت، جنوری، مارچ ۲۰۱۶ء۔

29) ابو شہیم خان، ڈاکٹر، ''لسانیات اور ترجمہ کے اصول'' اردو ریسرچ جرنل، شمارہ نمبر ۱۷، سنہ اشاعت، جنوری، مارچ ۲۰۱۹ء۔

30) شباب للت، ڈاکٹر، ''منظوم ترجمے کا فن اور روحانی ادب'' آجکل، جلد نمبر ۶۹، شمارہ نمبر ۶، سنہ اشاعت، جنوری ۲۰۱۱ء۔

31) عزیز ابن الحسن، ''جامعہ عثمانیہ اور فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ'' اخبار اردو، جلد نمبر ۱۰، شمارہ نمبر ۳، سنہ اشاعت، مارچ ۱۹۹۳ء۔

32) محمد صلاح الدین عمری، ڈاکٹر، ''ترجمہ اور اس کے اصول و مناہج'' جلد نمبر ۱۵۷، شمارہ نمبر ۱، سنہ اشاعت، جنوری ۱۹۹۶ء۔

33) مسعود احمد چیمہ ''انگریزی زبان کے مترادفات اور مرادفات کا ترجمہ اور مسائل'' اخبار اردو،، جلد نمبر ۳، شمارہ نمبر ۵، سنہ اشاعت، مئی ۱۹۸۶ء۔

34) عابد معز، ''اصطلاحات فہمی'' اردو دنیا،، جلد نمبر ۱۹، شمارہ نمبر ۹، سنہ اشاعت، ستمبر ۲۰۱۷ء۔

35) عطش درانی، ڈاکٹر، ''اصطلاحات کا مکتب فکر'' اخبار اردو، جلد نمبر ۹، شمارہ نمبر ۱۲، سنہ اشاعت، دسمبر ۱۹۹۲ء۔

36) احمد سہیل، ''ترجمہ نگاری: چند پہلو'' شاعر، جلد نمبر ۸۰، شمارہ نمبر ۱، سنہ اشاعت، جنوری ۲۰۰۹ء۔

37) عطش درانی، ڈاکٹر، ''اصطلاحات سازی کے منصوبوں کا تجزیہ''اخبار اردو، جلد نمبر ۱۱، شمارہ نمبر ۱۱، سنہ اشاعت، نومبر ۱۹۹۴۔

38) عطش درانی، ڈاکٹر، ''اردو میں دفتری اصطلاحات کا منظر نامہ''اخبار اردو، جلد نمبر ۱۰، شمارہ نمبر ۷، سنہ اشاعت، جولائی ۱۹۹۳۔

39) عطش درانی، ڈاکٹر، ''اردو میں تعلیمی اصطلاحات''اخبار اردو، جلد نمبر ۱۰، شمارہ نمبر ۳، سنہ اشاعت، مارچ ۱۹۹۳۔

40) کوثر مظہری، ڈاکٹر، ''شعر غالب کے انگریزی تراجم'' آجکل، جلد نمبر ۶۸، شمارہ نمبر ۷، سنہ اشاعت، فروری ۲۰۱۰۔

41) سید حسن سردار ''نیر مسعود کے فارسی افسانوں کے تراجم کا تنقیدی جائزہ'' فیضانِ ادب، جلد نمبر ۳، شمارہ نمبر ۴، ۳، ۲، سنہ اشاعت، اپریل تا دسمبر ۲۰۱۸۔

42) سید ہاشمی فرید آبادی ''ترجمہ کے چند پہلو'' ماہِ نو، جلد نمبر ۴، شمارہ نمبر ۱۲، سنہ اشاعت، مارچ ۱۹۵۲۔

43) سید باقر حسین ''ترجمہ کے اصول'' ماہِ نو، جلد نمبر ۳، شمارہ نمبر ۶، سنہ اشاعت، ستمبر ۱۹۵۰۔

44) احمد سہیل ''ترجمے کی تجرید'' ادبِ لطیف، جلد نمبر ۵۴، شمارہ نمبر ۳، سنہ اشاعت، مارچ ۱۹۸۸۔

45) مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، ''ادبیات عالم میں ترجمے کی روایت'' سہ ماہی اردو، جلد نمبر ۲۶، شمارہ نمبر ۴، سنہ اشاعت، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۶۔

46) مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، ''مغرب سے ادبی اور علمی تراجم'' نقوش، شمارہ نمبر ۱۳۷، سنہ اشاعت، دسمبر ۱۹۸۸۔

47) مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، ''ترجمے کا فن: جواز اور مشکلات'' شب خون، جلد نمبر ۲۲، شمارہ نمبر ۱۵۱، سنہ اشاعت، مارچ تا اپریل ۱۹۸۹۔

48) مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، ''اردو میں علمی تراجم'' ماہنامہ قومی زبان کراچی، جلد نمبر ۵۷، شمارہ نمبر ۹، سنہ اشاعت، ستمبر ۱۹۸۶۔

49) مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، ''ترجمے کی مشکلات'' ماہنامہ قومی زبان کراچی، جلد نمبر ۵۷، شمارہ نمبر ۱۲، سنہ اشاعت، دسمبر ۱۹۸۶۔

50) مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، مترجم کی ذات اور تراجم کی کتاب شماری ''ماہنامہ قومی زبان کراچی، جلد نمبر ۵۸، شمارہ نمبر ۳، سنہ اشاعت، مارچ ۱۹۸۷۔

51) خاطر غزنوی، ''شیکسپیئر کے اردو تراجم'' اردو نامہ، شمارہ نمبر ۱۷، سنہ اشاعت، جولائی تا اکتوبر ۱۹۶۱۔

52) عبدالحق، ''اردو میں علمی اصطلاحات'' اردو، جلد نمبر ۲۵، شمارہ نمبر ۱، سنہ اشاعت، جنوری ۱۹۴۵۔

53) مولانا محمد اسحٰق رضوی مصباحی، ''زبان شناس مترجم'' یادگارِ رضا، سنہ اشاعت، ۲۰۰۹۔

54) محمد بخش ہاشمی، ''اردو زبان میں ترجمے کے مسائل'' اخبار اردو، جلد نمبر ۳، شمارہ نمبر ۱، سنہ اشاعت، جنوری ۱۹۸۶۔

55) رابعہ سرفراز، ''تراجم کے مسائل'' اخبار اردو، جلد نمبر ۲۱، شمارہ نمبر ۱۰، سنہ اشاعت، اکتوبر ۲۰۰۵۔

56) عطش درانی، ''اردو ترجمے کی فنی تاریخ'' اخبار اردو، جلد نمبر ۲، شمارہ نمبر ۲، سنہ اشاعت، فروری ۱۹۸۶۔

57) شان الحق حقی، ''اپنے ترجمے کے بارے میں'' اخبار اردو، جلد نمبر ۲، شمارہ نمبر ۴، سنہ اشاعت، اپریل ۱۹۸۵۔

58) عرفان علی یوسف ''اشتہارات کا ترجمہ'' اخبار اردو، جلد نمبر ۲، شمارہ نمبر ۵، سنہ اشاعت، ۱۹۸۲۔

59) ہلال احمد زبیری، ''اردو زبان میں نراجیت'' اخبار اردو، جلد نمبر ۲، شمارہ نمبر ۳، سنہ اشاعت، مارچ ۱۹۸۲۔

60) عطش درانی، ''مترجمین اور تراجم'' اخبار اردو، جلد نمبر ۶، شمارہ نمبر ۱، سنہ اشاعت، جنوری ۱۹۸۹۔

61) حبیب صدیقی، ''اصطلاحات کے تراجم کی اہمیت'' اخبار اردو، جلد نمبر ۳، شمارہ نمبر ۵، سنہ اشاعت، مئی ۱۹۸۶۔

62) محمد نعمان خان، ڈاکٹر، ''سرمایہ ادب'' دبستان بھوپال، ۲۰۰۸۔

63) گیان چند جین، ڈاکٹر، ''تحقیق کا فن'' ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۵۔

64) محمد جنید ذاکر، ڈاکٹر، ''اصطلاحی مطالعے'' ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، مئی ۲۰۱۵۔

65) عبدالستار دلوی، پروفیسر، ''ادبی اور لسانی تحقیق'' بمبئی یونی ورسٹی، بمبئی، ۱۹۸۴۔

66) اردو ادب و ترجمہ نگاری (نصابی کتاب) ، ڈاکٹر بی آر امبیڈکر یونیورسٹی حیدر آباد، دکن۔ ۲۰۰۸۔

67) قمر رئیس، ڈاکٹر، ''ترجمہ کا فن اور روایت'' ایجوکیشنل بک ہاؤس، علیگڑھ، ۲۰۰۴۔

☆☆☆

اردو رسائل و جرائد میں فن ترجمہ سے متعلق شائع شدہ مضامین کا توضیحی اشاریہ